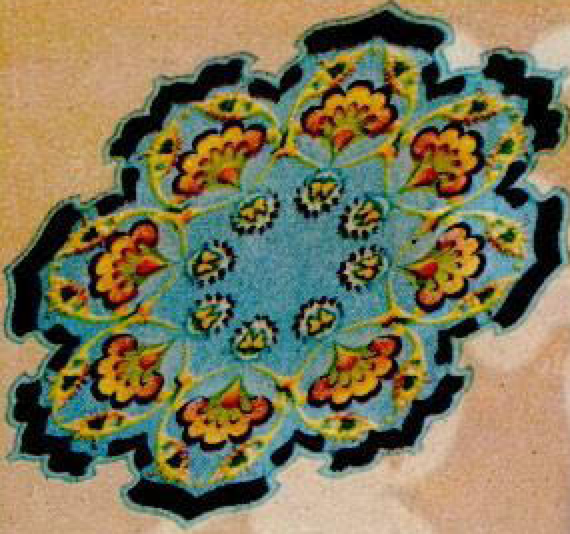


خطبات احتشام



خطیب پاکستان

حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی نور اللہ مرقدہ

ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ

بیرون بوہڑ گیٹ نزد چوک فوارہ ملتان پاکستان

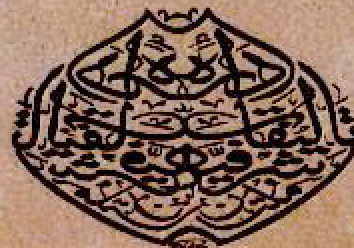
☏061-540513-541377

Mob: 0303-6662980

E-MAIL: Ishaq90@hotmail.com

Website

WWW.Taleefat-e-Ashrafia.Com



خُطباتِ احتشام

جلد چہارم

از

خطیبِ پاکستان حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی نوراللہ مرقدہٗ

مرتبہ

حافظ محمد اکبر شاہ بخاری

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان فون:4540513-4519240



نام کتاب.......................خطبات احتشام

تاریخ اشاعت.......................جمادی الثانی ۱۴۲۶ھ

ناشر...... ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان

طباعت.......................سلامت اقبال پریس ملتان

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ چوک فوارہ ملتان --- ادارہ اسلامیات انار کلی، لاہور

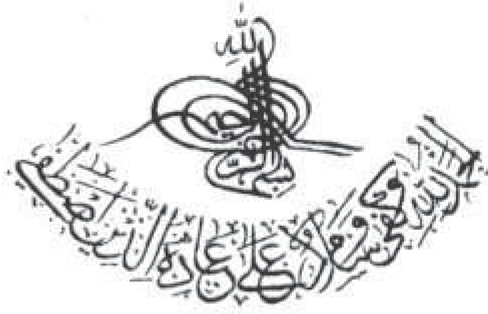
مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار، لاہور --- مکتبہ قاسمیہ اردو بازار لاہور

مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ، کوئٹہ --- کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی

یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور --- دارالاشاعت اردو بازار کراچی

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K (ISLAMIC BOOKS CENTRE)
119-121-HALLIWELL ROAD BOLTON BL13NE. (U.K.)

ضروری وضاحت: ایک مسلمان جان بوجھ کر قرآن مجید، احادیث رسول ﷺ اور دیگر دینی کتابوں میں غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا بھول کر ہونے والی غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کیلئے بھی ہمارے ادارہ میں مستقل شعبہ قائم ہے اور کسی بھی کتاب کی طباعت کے دوران اغلاط کی تصحیح پر سب سے زیادہ توجہ اور عرق ریزی کی جاتی ہے۔ تاہم چونکہ یہ سب کام انسان کے ہاتھوں ہوتا ہے اس لئے پھر بھی کسی غلطی کے رہ جانے کا امکان ہے۔ لہٰذا قارئین کرام سے گذارش ہے کہ اگر ایسی کوئی غلطی نظر آئے تو ادارہ کو مطلع فرمادیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو سکے۔ نیکی کے اس کام میں آپ کا تعاون صدقہ جاریہ ہوگا۔ (ادارہ)



عرض ناشر

خطیب پاکستان مولانا احتشام الحق تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خطبات کی چوتھی جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

حضرت موصوفؒ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں اللہ پاک حافظ اکبر بخاری شاہ صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائیں جنہوں نے محنت شاقہ سے ان خطبات کو جمع کر کے امت پر احسان عظیم فرمایا۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء

والسلام

محمد اسحٰق عفی عنہ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

از حضرت مولانا مفتی سید عبدالشکور ترمذی صاحب مدظلہ

خطیب پاکستان مفسر قرآن حضرت مولانا الحاج الحافظ احتشام الحق تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کوئی محتاج تعارف نہیں ہے وہ ایک نامور عالم دین اور بے مثل خطیب تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فاضل اور علوم دینیہ میں مکمل مہارت وفقاہت کے حامل ایک حق گو عالم دین تھے۔ مولانا مرحوم رحمۃ اللہ علیہ عام خطیبوں اور مقررین کی طرح ایک مقرر اور خطیب ہی نہیں تھے بلکہ اوصاف وکمالات کے اعتبار سے ایک جامع ہمہ اوصاف شخصیت بھی تھے اور خاندانی ونسبی حیثیت سے اعلیٰ درجے کی شرافت اور تلمذ وارادت کے لحاظ سے بھی روحانی رشتہ اپنے زمانہ کے مشاہیر علماء اور مشائخ عظام سے قائم تھا۔ حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ مولانا مرحوم کے ماموں اور روحانی مربی تھے انہوں نے اپنا اصلاحی اور تربیت روحانی کا رشتہ بھی حضرت حکیم الامت سے ہی قائم کیا تھا اور شیخ الاسلام حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی قدس سرہ کی طرف سے تکمیل سلوک کے بعد مجاز بیعت قرار پائے تھے۔ حضرت حکیم الامت سے نسبی اور روحانی رشتہ کے علاوہ سیاسی مسلک میں بھی ہمنوائی تھی اور دوقومی نظریے اور تحریک پاکستان کے بڑے سختی کے ساتھ حامی تھے۔ مولانا کی پوری سیاسی زندگی دوقومی نظریے اور پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کے تحفظ کے گرد گھومتی نظر

آتی ہے اور وہ اس سلسلہ میں کسی قسم کی مفاہمت اور رواداری کے قائل نہیں تھے۔ مولانا کو اپنے اس نظریے کی صداقت پر سختی سے اصرار تھا، ہر اس شخص اور جماعت سے مولانا کو سخت اختلاف رہا جس کے بارہ میں اس نظریے کی مخالفت کا ادنیٰ شبہ بھی ان کو ہو گیا پھر اس اظہار اختلاف میں بھی مولانا مرحوم نے کبھی کسی کی رورعایت نہیں کی وہ اپنے پرائے کا بھی کوئی امتیاز روا نہیں رکھتے تھے۔ جس مؤقف اور نظریے کو حضرت حکیم الامت تھانویؒ اور شیخ الاسلام شبیر احمد عثمانیؒ کے سیاسی نظریات سے مختلف پایا آپ نے اس مسلک ونظریے سے برملا بیزاری کا اظہار فرمایا اور آخر دم تک حضرت حکیم الامت اور حضرت شیخ الاسلام کے مسلک ونظریات پر قائم رہے اور اسی نظریے اور مؤقف کو صحیح سمجھ کر بلا خوف لومۃ لائم اس کے اعلانیہ داعی اور ترجمان رہے اور اسی کو اپنی زندگی کا شعار بنائے رہے۔

ہمارے عزیز محترم حافظ سید محمد اکبر شاہ بخاری سلمہ نے اپنی کتاب ''حیات احتشام'' میں مولانا کے ہر ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے اور خاص طور پر مولانا مرحوم کے سیاسی نظریات کو تفصیلاً ذکر کیا ہے۔

مولانا مرحوم کی حیات اور خدمات پر ایک جامع اور دلکش تالیف ہے اور عزیز سلمہ کی محنت کاوش کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ''حیات احتشام'' کے علاوہ عزیز موصوف نے ''خطبات احتشام'' کے نام سے مولانا مرحوم کے خطبات ومواعظ حسنہ کو بھی مرتب کیا ہے جس کی یہ زیر نظر کتاب خطبات احتشام کی چوتھی جلد ہے اس میں بھی مولانا مرحوم کے خطبات ومقالات سے مولانا کے سیاسی نظریات واضح طور پر سامنے آتے ہیں اور مولانا کی علمی وسیاسی بصیرت کو سمجھنے کیلئے کافی مواد ملتا ہے۔ بہر حال مولانا مرحوم کو مجمع عام میں تقریر وخطابت کی جو بے نظیر صلاحیت اور قابلیت اللہ تعالیٰ نے عطاء فرمائی تھی اس کا مشاہدہ تو عام جلسوں، کانفرنسوں اور اجلاسوں میں ہر خاص وعام کو ہوتا رہتا تھا مگر عام مجلسوں اور محفلوں میں خاص طور پر اونچی سوسائٹیوں میں مولانا کا انداز گفتگو اور طرز بیان قابل دید ہوتا تھا، مولانا مرحوم اپنے مدعا کو ایسے طریقے سے پیش کرتے تھے کہ بڑے بڑے معاند اور مخالف کو بھی سوائے سکوت کے اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا، ایسی مجالس میں مولانا کی ذہانت، حاضر جوابی برجستگی اور

نکتہ آفرینی کا خوب خوب ظہور ہوتا تھا پھر مخاطب کے مزاج و مذاق کی رعایت کے ساتھ اپنے مؤقف کی پختگی میں سر موفرق نہیں آنے دیتے تھے تاہم گفتگو میں چہرے پر مسکراہٹ و بشاشت اول تا آخر یکساں طور پر قائم رہتی تھی۔ مولانا مرحوم اپنے اس مخصوص طرز گفتگو اور ملکہ تفہیم کی بدولت بھی تمام علماء کرام کی جماعت میں امتیازی شان کے حامل تھے۔ بقول حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری قدس سرہ علماء کی جماعت میں مولانا مرحوم ایک دولہا کی حیثیت رکھتے تھے۔ دستور اسلام اور اسی طرح کے دوسرے دینی مسائل کے سلسلہ میں منعقد ہونے والی اونچے طبقے کی مجلسوں میں مولانا مرحوم نے ہمیشہ علماء حق کے ترجمان کی حیثیت سے کام انجام دیا اور علماء کرام کے وفود کیلئے رابطہ کا فرض ادا کرتے رہے۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا مفتی محمد حسن امرتسری، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا خیر محمد جالندھری، مولانا رسول خان ہزاری، مولانا محمد ادریس کاندھلوی اور مولانا اطہر علی رحمہم اللہ وغیرہم تمام اکابر علماء کرام نے نظام اسلام کیلئے اپنی کوششوں میں مولانا احتشام الحق تھانوی پر پورا پورا اعتماد فرمایا اور نظام اسلام کی تحریک سے وابستگی رکھنے والے سب بزرگوں نے مولانا تھانوی مرحوم کی مساعی جمیلہ اور انتھک کوششوں کو ہمیشہ قدر و عظمت کی نگاہ سے دیکھا۔ اور مولانا مرحوم ہمیشہ ان سب بزرگوں کے محبّ و محبوب رہے۔

اللہ تعالیٰ عزیز سلمہ کی اس کاوش و محنت کو شرف قبولیت عطا فرمائیں۔ عزیز سلمہ نے ''حیات احتشام'' اور ''خطبات احتشام'' مرتب کر کے وقت کی اہم ضرورت کو پورا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کتابوں کو عوام و خواص کیلئے نافع اور مفید بنا دیں اور مرتب اور ناشر کو اس کی جزائے خیر عطا فرمائیں۔ آمین!

سید عبدالشکور ترمذی عفی عنہ
مہتمم جامعہ حقانیہ ساہیوال ضلع سرگودھا

علماء حق کی زینت اور لحن داؤدی کا پیکر
مع وجیہاً فی الدّنیا والاخرۃ

(۱)۔خطیب پاکستان مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

ایک ممتاز عالم دین کی حیثیت سے تحریک پاکستان کے پر جوش حامی اور بے لوث خادم اسلام تھے تقسیم ملک سے پہلے آپ نیو دہلی کے سیکٹریٹ کی جامع مسجد کے خطیب ہونے کے سبب اگر مسلم لیگی راہنماؤں کے دوست اور مذہبی راہنما تھے زعماء لیگ آپ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے اور تقریبات شادی وغمی میں آپ کی شرکت کو باعث رحمت تصور کرتے۔

(۲)۔قیام پاکستان کے بعد چونکہ پاکستان کا دارالخلافہ کراچی تھا بدیں وجہ آپ نے کراچی کو دعوت تبلیغ کا مرکز بنایا کراچی میں ایک عظیم الشان (جیکب لائن وسیع وعریض جامع مسجد کی تعمیر کی اور ٹنڈو اللہ یار میں دارالعلوم اسلامیہ قائم کیا۔ جہاں سینکڑوں طالب علم اقامت پذیر ہو کر درس نظامی کے تحت تمام علوم عربیہ اسلامیہ کی تعلیم پاتے ہیں۔

(۳)۔حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں آپ ان کے دست راست اور جمعیت علماء اسلام کے جنرل سیکرٹری ناظم اعلیٰ کے فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں حضرت کی زندگی میں دوسری دینی جماعتوں کی حیثیت ذیلی تھی اصل جماعت جمعیت علماء اسلام ہی تھی جس نے نظام اسلامی کے سلسلہ میں بھرپور کوشش کی جس کا اثر یہ ہوا کہ پاکستان کو اسلامیہ جمہوریہ آئینی طور پر بنا دیا گیا اور قرارداد مقاصد کی منظوری کے بعد ملک صحیح معنوں میں اسلامی سلطنت بنا ۲۲ نکات پر اتفاق کا کارنامہ سرانجام دیا حضرت شیخ الاسلام ضعف پیری کے باعث ملک کے دور دراز علاقوں میں نہ جا سکتے تھے یہ مولانا احتشام الحق تھانوی کی ذات تھی جو سارے پاکستان کا دورہ کرتے تھے اور پیش آمدہ مسائل میں جمعیت علماء اسلام کا نقطہ نگاہ ظاہر فرماتے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے تمام بڑے

شہروں اور قصبوں میں آپ کی آواز گونجتی اور فرزندان اسلام مولانا کی آواز پر لبیک کہتے۔

(۴)۔ راقم الحروف جمعیت علماء اسلام پنجاب کا ناظم اعلیٰ تھا اور عزیز مولانا محمد عبدالعلیم صاحب ناظم تھے جب بھی حضرت پنجاب تشریف لاتے ہم دونوں بھائی ساتھ رہتے لاہور جیسے مرکزی شہر میں حضرت کا بارہا خطاب ہوا ہمارے مدرسہ کے سالانہ جلسوں میں بھی حضرت تشریف لاتے تھے آپ کو اللہ نے لحن داودی عطا فرمایا تھا عربی مدارس کے طلبہ اور اساتذہ تو آپ کے گرویدہ تھے ہی کالجوں سکولوں کے طلبہ بھی مولانا کی تقریر دلپذیر شوق و ذوق سے سنتے ملازم پیشہ حضرات وکلاء تجار ہر ایک کی خواہش ہوتی کہ مولانا کی زبان شیریں سے اللہ کا پاک کلام سنیں اور اپنی روح کو نئی زندگی دیں مولانا کا انداز بیان، انداز فکر اور انداز تبلیغ کا طرز کچھ ایسا تھا جس کو احاطہ تحریر میں لانا مشکل ہے وہ اپنی ذات اور صفات میں اپنی مثال آپ تھے آپ کی قد آور شخصیت وجاہت ظاہری اور باطنی رہی تھی کہ صحیح معنوں میں وجیہا فی الدنیا والآخرہ کا عملی پیکر نظر آتے۔

(۵)۔ مولانا کی زندگی میں دو مرتبہ الیکشن ہوا جس میں آپ کی جرات اور بے باکی نمایاں طور پر ظاہر ہوئی بعض اضلاع میں مخالفین سر توڑ کر کوشش کرتے کہ مولانا کی تقریر نہ ہو سکے۔

ایک مرتبہ تشریف لائے فرمانے لگے سرگودھا کے لوگ سخت ہیں وہاں سے مسلسل دھمکی کے خطوط آ رہے ہیں اور یہی حال گوجرانوالہ کا ہے ان دو شہروں میں جانا تو رسوائی کا باعث ہوگا وہاں جلسہ کرنا مشکل ہے ان دو شہروں کا پروگرام منسوخ کر دینا چاہئے کیونکہ وہاں کے مقامی علماء دوسرے گروہ میں شامل ہیں چونکہ راقم الحروف ضلع سرگودھا کے رہنے والے ہیں وہاں پر قبلہ والد صاحب پچیس برس تک سرگودھا شہر میں خطیب رہے ہیں اس لئے مولانا کو عرض کیا آپ فکر نہ کریں سرگودھا شہر تو ہمارا شہر ہے فرمانے لگے آپ سب بھائی تو عرصہ دراز سے لاہور میں رہتے ہیں اب وہاں دوسرے لوگوں کا زور ہے جواباً عرض کیا آپ دعا فرمائیں وہاں جلسہ ہوگا گوجرانوالہ میں بھی راقم الحروف اور محترم عزیز مولانا محمد عبدالعلیم قاسمی تین برس تک رہے ہیں اور مختلف مساجد میں درس قرآن دیتے رہے ہیں وہاں بھی

اللہ کی رحمت سے پرانے دوست احباب ذی اثر ہیں کہ جلسہ کامیاب ہوگا حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تردد میں تھے الحمدللہ اس عاجز نے اپنے دونوں فرزند حافظ حسین احمد قاسمی اور قاری محمود الحسن قاسمی کو سرگودھا بھیج دیا تاکہ جلسہ کا وسیع گراؤنڈ متصل سٹی تھانہ میں انتظام کریں جناب عبدالحمید صاحب باجوہ مرحوم اتفاقاً وہاں ایس پی تھے انہوں نے نہ صرف بھرپور تعاون کیا بلکہ اپنی گاڑی بھی لائل پور مولانا کو لانے کیلئے حسین محمود کے حوالہ کر دی خدا کے فضل وکرم سے ایسا عظیم الشان جلسہ ہوا جس کی مثال سرگودھا شہر میں نہیں ملتی اسی طرح گوجرانوالہ میں مدرسہ عربیہ میں جلسہ کیا گیا وہ بھی حد درجہ کامیاب رہا حضرت فرماتے ہمارا خیال تھا کہ آپ کا اثر صرف لاہور میں ہے لیکن آپ تو پورے پنجاب پر چھائے ہوئے ہیں یہ حضرت کا حسن ظن تھا۔

(۶)۔اس قسم کے متعدد واقعات اور مشاہدات ہیں جو اس مختصر مضمون میں شائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے جلسہ تقسیم اسناد مدرسہ اسلامیہ ٹنڈ واللہ یار (سندھ)

جنرل ایوب خان کے دور میں اس جلسہ کا اہتمام خود حضرت نے فرمایا تھا جس میں صدر پاکستان محمد ایوب خان بھی شریک ہورہے تھے۔لاہور سے حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور ہم دونوں بھائی ٹنڈ واللہ یار گئے راولپنڈی سے شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان صاحب مرحوم ملتان سے مولانا محمد علی جالندھری و دیگر علماء شریک جلسہ ہوئے حضرت نے بڑے وسیع پیمانہ پر جلسہ کا انتظام کرایا تھا اس وقت مسند حدیث پر حضرت شیخ الحدیث مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی فائز تھے سندھ، پنجاب، سرحد، بلوچستان اور مشرقی پاکستان سے کثیر تعداد میں علماء کرام شریک جلسہ تھے یہ مولانا موصوف کا اثر ورسوخ تھا کہ ایوب خان جیسے آمر کو عربی مدرسہ کے اجلاس میں لائے ورنہ یہ لوگ تو کالجوں کے چکر میں رہتے ہیں ان کو عربی مدارس سے کیا غرض البتہ عربی مدارس کو قبھانے میں سعی لاحاصل کرتے رہتے ہیں۔

(۷)۔درس قرآن ریڈیو پاکستان

مولانا موصوف سالہا سال تک روزانہ صبح کے وقت ریڈیو پاکستان پر درس قرآن دیتے تھے جس کا اثر سارے ملک پر تھا اور اپنے پرائے بڑی عقیدت اور محبت سے اللہ کا پاک کلام

سنتے بعدازاں صرف ہفتہ میں ایک دن درس دیتے تھے آپ کا درس قرآن ریڈیو پاکستان ہر اول بھی تھا اور آخر بھی بعدازاں اب تک درس قرآن ریڈیو پاکستان پر نہ ہوسکا مولانا مرحوم کی وفات کے بعد کراچی کا شہر خطیب اسلام سے ایسا خالی ہوا جس کا پر ہونا خدا کی قدرت کا منتظر ہے سچی بات یہ ہے کہ کراچی میں کوئی خطیب نہ رہا جو ہیں وہ نہ ہونے کے برابر ہیں آپ کی وفات کے بعد کراچی شہر میں اہل بدعت اور اہل رفض نے انگڑائی لی اور نورانی میاں اپنے لاؤلشکر کے ساتھ میدان میں آیا ورنہ مولانا کی زندگی میں ان کو جرات نہ ہوئی۔

(۸)۔ بہرحال مولانا کی ذات ستودہ صفات ہمہ گیر شخصیت کی حامل تھی مولانا علماء کی زینت تھے ان کے رخصت ہوجانے کے بعد فن خطابت میں خاص طور پر ایسا خلا پیدا ہوا ہے جس کا پر ہونا مشکل ہے۔

(۹)۔ چودھویں صدی کا آخری عشرہ بلا ریب قیادت کا منظر پیش کرتا ہے ایسے ایسے برگزیدہ اور نامور علماء صلحاء امت اور مشائخ رخصت ہوئے ہیں جن کی مثال پندرہویں صدی میں نہیں ملتی۔

چونکہ وعدہ خداوندی انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون سچا ہے اس لئے حق تعالٰی اپنے دین کی حفاظت کا کام اپنے خاص بندوں سے ضرور لے گا۔

ابوالحسین محمد عبدالحلیم قاسمی کان اللہ لہ ولوالدیہ

بانی و مہتمم جامعہ قاسمیہ گلبرگ نمبر۲ لاہور

صدر مرکزی جمعیت علماء احناف پاکستان

حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کا سفرآخرت

اَلحمدُ لِلّٰہِ نَحمَدُہٗ وَنستَعِینُہٗ وَنَستغفِرُہٗ وَنُؤمِنُ بِہٖ وَنَتوَکَّلُ عَلَیہِ وَنَعُوذُ بِاللّٰہِ مِن شُرُورِ اَنفُسِنَا وَمِن سَیِّاٰتِ اَعمَالِنَا مَن یَّھدِہِ اللّٰہُ فَلا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضلِلہُ فَلا ھَادِیَ لَہٗ وَنشھَدُ اَن لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحدَہٗ لا شَرِیکَ لَہٗ وَنَشھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَولَانَا مُحَمَّدًا عَبدُہٗ وَرَسُولُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیرِ خَلقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصحٰبِہٖ اَجمَعِینَ.

اَمَّا بَعدُ! فَاَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ.

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ.

اَلیَومَ اَکمَلتُ لَکُم دِینَکُم وَاَتمَمتُ عَلَیکُم نِعمَتِی وَرَضِیتُ لَکُمُ الاِسلَامَ دِیناً.

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سفر آخرت

بزرگان محترم برادران عزیز!

اب آج حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری لمحات کے بارے میں یعنی آپ کی وفات اور آپ کے وصال کے بارے میں عرض کرنا چاہتا ہوں، یہ بھی سیرت طیبہ ہے اور بعضے بزرگوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ جب آپ کا وصال ہوا اور آپ دنیا سے تشریف لے گئے تو ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے۔ وہ یہ کہ ہر نبی اور پیغمبر جب دنیا سے تشریف لے جاتے تھے تو وہ یہ اعلان فرماتے تھے کہ میرے بعد ایک نبی آنے والے ہیں۔ مگر آپ نے فرمایا کہ میرے بعد اب کسی نبی اور پیغمبر کے آنے کا سوال نہیں ہے۔ اس لئے کہ جن مقاصد کے لئے جن کاموں کے لئے اور جن ذمہ داریوں کے لئے اللہ تعالیٰ نبی بھیجتے تھے۔ وہ ذمہ داریاں اللہ نے میرے بعد میرے ہر امتی کے اوپر ڈال دیں۔ میری امت کے ہر فرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ یہ کام کریں کہ جس کے لئے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام تشریف لایا کرتے تھے۔ اب کسی نبی کے اور پیغمبر کے آنے کا سوال ہی نہیں۔

اس لئے علماء نے لکھا ہے کہ آپ کی وفات اور آپ کا وصال یہ عموم بعثت ہے عموم بعثت کے معنی یہ ہیں کہ پہلے ایک فرد کی بعثت تھی۔ حضور تشریف لائے۔ آپ نے کام انجام دیئے، لیکن فرمایا کہ اب عمومی طور پر امت پر یہ ذمہ داری ڈال دی گئی ہے یعنی نبی کی بعثت کا کام آپ کی امت کے ذمہ ڈال دیا گیا۔ اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا اور آپ کی وفات کا واقعہ بھی نہایت اہم واقعہ ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ سن ۱۰ ہجری میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حج ادا فرمایا۔ حج آپ نے بہت سے کئے لیکن اس کو شریعت کی اصطلاح میں حج اصغر کہتے ہیں، یعنی عمرہ، عمرے کو حج اصغر کہا جاتا ہے اور حج کو حج اکبر کہا جاتا ہے۔

عمرے میں عرفات کے میدان میں قیام نہیں ہے۔ منیٰ اور مزدلفہ کا قیام نہیں ہے۔ بلکہ خانہ کعبہ کا طواف ہے۔ صفا اور مروہ کے درمیان سعی ہے اور جب وہ سعی کے چکر پورے ہو جاتے ہیں تو پھر اس کے بعد احرام کھول دیا جاتا ہے سر کے بال کتروانے کے بعد حلق کیا جاتا ہے۔ یہ عمرہ ہو گیا۔ اس عمرے کو اصل میں حج اصغر کہا کرتے تھے، چھوٹا حج اور اس کے مقابلے میں جب وہ حج آیا کہ جس میں عرفات کے میدان میں جانا ہے۔ عرفان سے مزدلفہ اور مزدلفہ سے منی، یہ حج اکبر کہلایا۔

ہم اور آپ تو حج اکبر اس حج کو کہنے لگے کہ جو جمعہ کے دن ہو، لیکن اسلام میں اس کی کوئی اصلیت نہیں۔ اسلام تو حج اکبر عمرے کے مقابلے میں حج کو کہتا ہے یعنی یہ بڑا حج اور یہ چھوٹا حج، ہاں اگر حج جمعہ کے دن واقع ہو جیسا کہ خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حج ادا فرمایا ہے تو وہ جمعہ کا دن تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فضیلت در فضیلت، اور فضیلت بڑھ گئی اس فضیلت کا اظہار ہم اور آپ عوام کی زبان میں حج اکبر کے لفظ سے اس کو ادا کرنے لگے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم میں عام حج کو حج اکبر کہا گیا ہے۔

یہ میں نے تفصیل اس لئے عرض کی کہ سن ۱۰ ہجری میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حج ادا کیا ہے، یہی آپ کا پہلا حج ہے، یہی آپ کا آخری حج ہے۔ یہی حج، حج اکبر ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے آپ نے عمرے بہت سے ادا کئے ہیں۔ اور حج کا سوال اس لئے پیدا نہیں ہوا کہ ابھی اسلام میں حج فرض نہیں ہوا۔ حج فرض ہوا ہے ۹ ہجری میں۔ اور میں نے اس سے پہلے بھی آپ کو بتایا ہے کہ بعض لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ حج سن ۶ ہجری میں فرض ہو گیا تھا۔ لیکن علماء نے اس بات کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ اس کو رد کر دیا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ حج کے معاملے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا رویہ آپ کا ارشاد نہایت سنگین اور سخت ہے۔ آپؐ نے فرمایا اور حدیث قدسی کے طور پر آپؐ نے فرمایا کہ جس آدمی پر حج فرض ہو جائے اور وہ حج کو ٹالتا رہے۔ اس سال نہیں۔ اگلے سال اگلے سال نہیں، اس سے اگلے سال۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ اللہ کا ذمہ بری ہے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ

یہودی ہو کے مرے گا، یا نصرانی ہو کے مرے گا۔

جب خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حج کی تاخیر کے سلسلے میں اتنی ناراضگی کا اظہار فرما رہے ہیں تو یہ بھلا! یہ بات کبھی سمجھ میں آتی ہے کہ حج ۶ ہجری کو فرض ہو جاتا اور ۹ ہجری تک آپ حج ادا نہ کرتے۔ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ جب حج آپؐ پر فرض ہو گیا اور آپ تو اس مقام اور اسی جگہ پر موجود ہیں کہ جہاں حج ادا کیا جاتا ہے۔ یعنی حجاز میں موجود ہیں۔

ہمارے اور آپؐ کی فرضیت میں تھوڑا سا فرق ہے۔ اگر وہاں تک پہنچنے کے وسائل ہمارے اور آپ کے پاس موجود نہیں ہیں تو ابھی ہم پر حج فرض نہیں ہوا، اتنے پیسے نہیں ہیں کہ جو ہم کرایہ ادا کر سکیں یا اس مروجہ انتظام سے جا سکیں۔ لیکن جو آدمی جس کے پاس پیسے بھی نہ ہوں اگر وہ ایام حج میں اس سرزمین پر ہو کہ جہاں پر حج کیا جاتا ہے تو اس پر حج فرض ہو جاتا ہے۔ جیسے ایک شخص کسی ملازمت کے سلسلے میں کسی اور ضروری سفر کے سلسلے میں اتفاق سے ذی الحجہ کے پہلے عشرے میں مکہ میں موجود ہے اس لئے اس پر حج فرض ہو گیا۔ اب یہ ادا کرے گا اپنا حج فرض ادا کرے گا۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر حج سن ۶ ہجری میں فرض ہو جاتا، آپ سن ۷ ہجری میں نہ کرتے، ۸ ہجری میں نہ کرتے، ۹ ہجری میں آپؐ حج ادا کرتے۔ یہ ممکن نہیں۔ کہ آپؐ اس کو ۳ سال تک ٹالتے۔ بلکہ صحیح قول یہ ہے کہ حج فرض ہوا ہے سن ۹ ہجری میں۔ تو سب سے پہلے اگلا سال جب آیا۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج ادا کیا۔ یہ آپ کا پہلا حج اور یہی آپ کا آخری حج ہے۔ اسی کو حجتہ الاسلام بھی کہتے ہیں، اس کو حجتہ الوداع بھی کہتے ہیں۔

حجتہ الاسلام تو اس لئے کہتے ہیں کہ اسلام کی تاریخ میں یہ پہلی مرتبہ حج فرض ہوا ہے۔ حجتہ الوداع اس لئے کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں سے اس حج میں رخصت ہو رہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا۔

اے میرے ساتھیو! مجھے حج کرتے ہوئے تم ذرا اچھی طرح غور سے دیکھنا اس لئے کہ ممکن ہے کہ اس کے بعد پھر یہ صورت دیکھنے کی نوبت نہ آئے۔ اچھی طرح دیکھ لینا کہ حج کس طرح ادا کیا

جاتا ہے۔ کیونکہ آپ ارشاد فرمارہے ہیں کہ پھر شاید اس کے بعد مجھے حج کرتے ہوئے نہ دیکھو۔

آپؐ نے دسویں ہجری میں حج ادا کیا اور حج ادا کر کے واپس مدینہ تشریف لے آئے، ذی الحجہ کے کچھ دن، محرم، صفر دو مہینے اگلے سال کے گزرے کہ ربیع الاول کی ۱۲ تاریخ کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ آپ نے حجۃ الوداع ادا کیا۔ تو ایک بات تو یہ پیش آئی کہ اسی حج کے موقعہ پر میدان عرفات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کریم کی ایک آیت دی گئی فرمایا کہ

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً

تکمیل دین کی بشارت سنادی گئی۔ اب دین کا کوئی ٹکڑا، دین کا کوئی حصہ، دین کا کوئی جز اب باقی نہیں رہا ہے۔ جتنا دین تھا سب دیا جا چکا ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ قرآن کی آیتوں میں سے یہ سب سے آخری آیت ہے۔ شاید آپ کو شبہ نہ ہو جائے، کبھی کبھی میں نے یہ بھی آپ کے سامنے کہا ہے کہ **اذا جاء نصر اللہ والفتح** یہ آخری سورت ہے۔ لیکن یہ دو باتیں الگ الگ ہیں۔

سب سے پہلے آیت، آیت کی حیثیت سے قرآن کریم کی جو نازل ہوئی ہے وہ **اقرا باسم ربک الذی خلق** ہے۔ لیکن سب سے پہلے سورت، سورت کی حیثیت سے، پوری سورت، وہ سورہ فاتحہ نازل ہوئی ہے۔

قرآن کریم کی آیتوں میں سے سب سے آخری آیت جو آیت اور ٹکڑے کے طور پر نازل ہوئی ہے، وہ **الیوم اکملت لکم دینکم** الخ ہے اور سورتوں میں سب سے آخری سورت **اذا جاء** ہے۔

جب آخری سورت آپؐ پر نازل ہوئی، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف رکھتے تھے، اور صحابہ موجود ہیں۔ آپؐ نے فرمایا، اللہ نے اپنے ایک بندے کو (اور وہ ایک بندے سے مراد خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے)۔

یہ اختیار دیا تھا کہ چاہے اور زیادہ دنیا میں قیام کرے اور چاہے تو اپنے رفیق اعلیٰ اور اللہ

سے مل جائے۔ فرمایا کہ اللہ کے اس بندے نے دنیا کے قیام کو پسند نہیں فرمایا۔ رفیق اعلیٰ کی ملاقات کو پسند فرمایا ہے۔ بات ہوگئی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ زار و قطار رونے لگے۔ صحابہؓ نے دریافت کیا کہ اے ابوبکر صدیق! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہ واقعہ ایک شخص کے بارے میں بیان کیا ہے۔ آپ کے رونے کی کیا بات ہے۔

بات یہ ہے کہ جس کو جتنی محبت ہوتی ہے، اتنا ہی اس پر اثر ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سب سے زیادہ ان حقائق کو سمجھنے والے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں تم سمجھے نہیں۔ یہ بات جو حضور نے ارشاد فرمائی ہے۔ یہ خود اپنے بارے میں فرمائی ہے اور کسی بندے کے بارے میں نہیں فرمائی۔ اور گویا کہ آج آپ اعلان فرما رہے ہیں کہ آپ نے سفر آخرت کا ارادہ کرلیا ہے۔ یہ اب آخری لحات ہیں جو حضور کے ساتھ گزر رہے ہیں۔

جب ایک چیز منزل کمال تک پہنچ جاتی ہے۔ تو منزل کمال پر پہنچنا اس بات کی نشانی ہے کہ اب اترنے والی ہے دین مکمل ہو چکا۔ اب آپ کی حاجت اور ضرورت نہیں ہے۔ اب آپ تشریف لے جائیں گے۔ ایسا ہی ہوا۔

کہ آپؐ حج کر کے مدینہ میں تشریف لائے۔ ذی الحجہ، محرم کا مہینہ گزرا، صفر کے مہینہ میں آخری چہار شنبہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی علالت اور بیماری کا سلسلہ شروع ہوا۔ آپ رات کو اٹھے اور جنت البقیع کی قبرستان کی طرف روانہ ہوگئے۔

جنت البقیع وہ ٹکڑا ہے جس میں لاکھوں خاصان خدا، صحابہ کرام، اولیاء اللہ، ازواج مطہرات، اہل بیت اور بہت سے اللہ کے مقبول بندے، اس کے اندر مدفون ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ میں جنت البقیع میں جاؤں اور اہل قبور کے لئے مغفرت کی دعا کروں۔ کیسی خوش قسمتی ہے ان قبر والوں کی کہ جن کے لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم مغفرت کی دعا فرمائیں۔ آپؐ مغفرت کی دعا کے لئے تشریف لے جا رہے ہیں۔ کسی صاحب دل نے بہت اچھی بات کہیں۔ فرمایا کہ ؎

کششے کہ عشق دارد نہ گزاردت بدینسان
بہ جنازہ گر نیائی بہ مزار خواہی آمد

یہ محبت کا کرشمہ ہے۔ یہ عشق کا کرشمہ ہے کہ اگر جنازے پر حاضری کی نوبت نہ ملی تو

بہرحال مزار پر تو آنا ہو ہی گیا۔

اور جن کی مزار پر اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مغفرت کی دعا نہیں فرمائی ان کو بھی ایک شرف، ایک عزت اور فضیلت یہ ملنے والی ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک دیکھیں گے...... کیسے؟

حدیث میں آتا ہے جو مسلمان اور اہل ایمان جہاں کسی ملک میں کسی سرزمین پر دفن کیا جائے گا۔ وہاں تین سوال ہوں گے۔ پہلا سوال یہ ہوگا۔ من ربک، آپ کا رب کون ہے۔ وما دینک اور آپ کا دین کا کیا نام ہے۔ ومن ھذا الرجل اور جن کی طرف ہم اشارہ کر کے پوچھ رہے ہیں۔ انہیں دیکھو اور بتاؤ یہ کون ہیں۔

یہ مقام تو حضرت رابعہ بصریہ کو حاصل ہے۔ فرمانے لگیں کہ اگر مجھ سے منکر نکیر نے یہی سوال کیا تو میں انہیں جواب دوں گی۔ ہم اور آپ تو نہیں کہہ سکتے، ہمیں تو اس وقت کے تصور سے خوف ہے کہ آیا ہمارے ہوش وحواس بھی درست ہوں گے یا نہیں۔ جواب دے سکیں گے یا نہیں دے سکیں گے۔ لیکن یہ مقام ناز کا مقام ہے جو اللہ والوں کو حاصل ہوتا ہے۔ فرماتی ہیں

گر نکیر آید و پرسد کہ بگو رب تو کیست ۔۔۔ گویم آنکس کہ ربود ی دل دیوانہ ما

اگر فرشتوں نے مجھ سے آ کے یہ پوچھا کہ تیرا رب کون ہے۔ میں یہ کہوں گی کہ تو میرا رب پوچھتا ہے۔ میرا رب وہ ہے جس کے لئے میں نے دونوں جہاں چھوڑ دیئے۔ جس کی خاطر میں نے اپنی ساری عمر وقف کر دی۔ وہ مرا رب ہے۔ ناز کے عالم میں، مستی کے عالم میں فرماتی ہیں۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔ اے عمرؓ!

قبر کی تنہائی میں جب یہ سوال کیا جائے گا کہ من ربک وما دیناک ومن ھذا الرجل تو کیا جواب دو گے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یارسول اللہ ایک بات یہ بتا دیجئے کہ ہمیں اس وقت ہوش ہوگا یا نہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ ہوش تو بہت زیادہ ہوگا۔ یہاں سے بھی زیادہ ہوگا۔ فرمایا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھر جب ہوش ہوگا تو پرواہ نہیں جواب دیں گے بیڑا پار ہو جائے گا۔ صحیح جواب دیں گے۔

تو میں نے عرض کیا کہ ومن ھذا الرجل یہ اشارہ کس کی طرف ہوگا، یہ سرکار دو عالم

صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہوگا۔ علماء نے لکھا ہے کہ جب کسی میت سے سوال کیا جائے گا خواہ دنیا کے کسی خطے اور زمین کے اندر اس کو دفن کیا گیا ہو تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جہاں آرام فرما رہے ہیں وہاں سے لے کر اس میت کی قبر تک زمین کے جتنے حجابات اور پردے ہیں وہ سب ہٹا دیئے جائیں گے ایک مؤمن اس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا اور یہ ایمان کا تقاضا ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نظر ڈالتے ہی وہ یہ کہے گا کہ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

آپؐ کی محبت کا تقاضا تو یہ تھا کہ دنیا میں جس جگہ میں مؤمن کا انتقال اور وصال ہو آپؐ تشریف لا کر اس کے جنازے کی نماز پڑھائیں۔ لیکن ایسا ممکن نہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جنت البقیع میں اہل قبور کے لئے مغفرت کی دعا مانگنے تشریف لے جا رہے ہیں۔ جن کی مغفرت کے لئے حضور کے ہاتھ اٹھ جائیں۔ کوئی اندازہ لگا سکتا ہے کیا وہ مغفرت سے بچ جائے گا۔ ضرور ہوگا۔

حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے ایک بات لکھی ہے فرمایا کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جا رہے تھے تو آپ کو یہ محسوس ہوا کہ یہ ایک پتھر ہے۔ یہ رو رہا ہے۔ آپ کہیں گے کہ پتھر میں تو حس نہیں ہے۔ ہمارے اور آپ کے اعتبار سے حس نہیں ہے لیکن اس میں حس ہے اور فرمایا کہ اگر پتھر میں حس نہیں تو **وان من الحجارة لما یتفجر منه الانهر وان منها لما یشقق فیخرج منه الماء وان منها لما یهبط من خشیة الله** کبھی کبھی پتھر اللہ کے خوف سے لرز کر اوپر سے نیچے گر جاتا ہے۔

پتھر میں خوف خدا ہے۔ اس میں بھی خشیت ہے۔ وہ رو رہا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ تیرے رونے سے دل کٹا جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ میں اس لئے رو رہا ہوں جب سے میں نے یہ سنا ہے کہ جہنم کے اندر، ایندھن کے طور پر جو چیز جلائی جائے گی وہ پتھر ہوں گے۔ **وقودها الناس والحجارة** میں اپنی قسمت پر رو رہا ہوں کہ ہائے میں پتھر پیدا کیا گیا۔ میں دوزخ کا ایندھن بن گیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر اس کے حق میں دعا مانگی اور فرمایا میں نے تیرے حق میں اللہ سے دعا کی ہے۔ اللہ تعالیٰ تجھے

بچالیں گے۔آپؐ تشریف لے گئے۔واپس تشریف لائے تو دیکھا کہ برابر رونے میں مصروف ہے۔آپؐ نے پھر پوچھا کہ تیرے رونے کی کیا بات ہے۔اس نے کہا کہ

کان ذلک بکاء الخوف وهذا بکاء السرور۔وہ خوف کا رونا تھا اور یہ خوشی کا رونا ہے۔کہاں میری قسمت کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم میرے حق میں دعا فرمائیں یہ وہ خوشی ہے کہ جس کی وجہ سے میرے آنکھوں سے آنسو تھمتے نہیں۔

کشتۂ کہ عشق دارد نہ گزاردت بدینسان　　　به جنازہ گر نیائی بہ مزار خواہی آمد

ہم اور آپ تو امتی ہیں۔صاحب ایمان ہیں۔اگر ہمارے دل میں یہ تقاضا ہو تو یہ ایمان کا تقاضا ہے۔اسلام کا تقاضا ہے۔لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ جانوروں کے دل میں بھی یہ تقاضا ظاہر ہو جائے۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ اپنے ہاتھ مبارک سے ۶۰ اونٹ ذبح کئے اور فرمایا کہ جب ایک اونٹ کو ذبح کر کے جب دوسرے کی باری آتی تھی تو وہ شوخیاں کرتا ہوا آخر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنی گردن پیش کر دیتا۔

کلهن یزدلفن الیه ایک سے ایک اونٹ بڑھ کر اپنی گردن پیش کرتا تھا۔

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برکف　　　بامید آنکہ روزی بشکار خواہی آمد

فرمایا کہ۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　　سر دوستان سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اگر آپؐ کے ہاتھوں ذبح ہونا ہے تو میرا گلا بھی تیار ہے۔

بات بڑھ گئی! ع لذیذ بود حکایت، دراز تر گفتم۔

آپ آدھی رات کو جنت البقیع کی طرف تشریف لے گئے۔اہل قبور کے لئے آپ نے مغفرت کی دعا فرمائی۔واپس تشریف لائے۔حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا۔ وارأس، وارأس، راس کے معنی ہیں سر، ہائے میرا سر تو چلا۔یعنی میرے سر میں سخت تکلیف ہے۔آپؐ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اس کا اظہار کیا۔سر کا درد بڑھتے بڑھتے بخار کی تکلیف میں تبدیل ہو گیا۔اور بخار کی یہ کیفیت بہت بڑھ گئی۔مگر اس کے ساتھ ساتھ

جن کاموں کے لئے آپ تشریف لائے تھے ان کاموں کی طرف سے ذہن نہیں ہٹا۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرکردگی میں ایک لشکر بھیجا جانے والا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لشکر کو بھی بھیجا۔ اس لشکر میں سے حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما تیمارداری کے لئے تشریف لے آئے۔ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی حضرت اسامہ بن زید سے اجازت لے کر آ گئے۔ مدینہ سے دو ایک میل کے فاصلے پر لشکر ٹھہرا ہوا ہے۔ آپ کی بیماری اور علالت کا سلسلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ تکلیف ابھی تک قابل برداشت ہے۔

۱۳ یا ۱۴ دن آپ کے بیماری کے گزرے۔ جن میں سے ایک ہفتہ اس طریقے پر آپ نے گزارا، آج کس بیوی کے گھر جانا ہے۔ آج کس کے یہاں میرے جانے کا نمبر ہے۔ تا کہ بیویوں کی حق تلفی نہ ہو۔ حالانکہ قرآن کریم میں صاف اور واضح طور پر ایک آیت نازل ہوئی۔ جس میں ارشاد فرمایا کہ اگر آپ ازواج مطہرات میں سے کسی ایک کے پاس بھی تشریف نہ لے جائیں تو یہ آپ کی کوتاہی میں شمار نہیں ہوگا۔ اور اس کا آپ پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

نفحۃ الیمن ایک کتاب ہے عربی میں۔ اس میں حکایتیں ہیں۔ اس میں ایک حکایت ہم نے طالب علمی کے زمانے میں پڑھی تھی کہ ایک شخص نہایت بدشکل، کالا، ایک ایسی عورت کو مار رہا ہے کہ جو نہایت جمیل و حسین نہایت خوبصورت ہے۔ ایک راہگیر نے یہ کہا کہ تو کیوں اس کو مار رہا ہے۔ اسے غصہ آ گیا۔ اس نے کہا میں اس آدمی کو مار ڈالوں گا۔ اس حسین اور خوبصورت خاتون نے کہا، اے راہگیر تم میرے معاملے میں دخل نہ دو۔ یہ میرا شوہر ہے۔ میں اس کی بیوی ہوں۔ اس نے یقیناً دنیا میں کوئی ایسا کام کیا ہے۔

کہ ہم دونوں اپنا اپنا بدلہ پا رہے ہیں۔ تمہیں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں یہ اپنے کئے کا بدلہ پا رہا ہے۔ میں اپنے کئے کا بدلہ پا رہی ہوں۔ تم کون ہو بیچ میں مداخلت کرنے والے۔

اندازہ لگایئے۔ کیا سوچنے کا انداز تھا۔ اور ایک اور بات عرض کر دوں۔

میں نے دوستوں سے ہمیشہ یہی عرض کیا ہے کہ آپؐ نے آخری عمر میں جو نکاح فرمائے ہیں۔ درحقیقت اس کا مقصد کثرت ازواج نہیں ہے۔ مقصد ہی اس کا یہ تھا کہ عورتیں آپ کی

بیوی بن کر آپ کی خانگی زندگی اور گھریلو زندگی کو دیکھیں اور ان حالات کو جمع کریں تا کہ آنے والی امت کے لئے شریعت اور دین کا کام دے سکیں۔ مگر اس کے باوجود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دلداری فرمار ہے ہیں۔ دلداری ہی نہیں بلکہ آپ ؐ نے بعض اوقات کبھی کبھی سخت قسم کا جواب بھی بیویوں کی طرف سے برداشت کیا ہے۔ آپ کی بیویوں میں سے ازواج مطہرات میں سے مزاج کے اعتبار سے ایک بیوی ایسی تھی اور نقل کفر کفر نباشد۔ ہمارا منہ نہیں ہے کہ ہم ایسی بات کہیں۔ ہم تو صرف نقل کرنے والے ہیں۔ ورنہ ہم تو ان کے جوتوں کے خاک کے برابر بھی نہیں۔ ان کا مزاج تھوڑا سخت تھا اور وہ کبھی کبھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب بھی دے دیتی تھی۔ یہ کون تھی؟ یہ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہیں جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیٹی ہیں۔ جس وقت وہ ذرا سختی سے بولتی تھیں۔ جواب دیتی تھیں۔ تیزی سے بولتی تھیں۔ آپ ؐ بڑے پیار و محبت کے الفاظ فرمایا کرتے تھے کتنا پیارا جملہ آپ ؐ فرمایا کرتے تھے۔ ھذہ بنت ابیھا یہ تو بالکل ہی بنائی اپنے باپ کی بیٹی ہے۔ یعنی جس طرح عمر فاروق ؓ کا مزاج تھوڑا سخت ہے۔ بیٹی کا بھی ویسا ہی ہے۔ لیکن آپ ؐ برداشت کرتے تھے۔

حضرت شاہ ابوالخیر، حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہید رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔ ان کی بیوی بڑی سخت مزاج تھی یعنی جب کسی طالب علم کو کسی کام کے لئے وہ گھر بھیجتے تھے تو وہ طالب علم روتا ہوا آتا تھا۔ یہ پوچھا کرتے تھے۔ کیا! بیگم صاحبہ نے کچھ برا بھلا کہا ہے۔ تو وہ آگے چپ ہو جاتا تھا۔ سمجھ جاتے تھے کہ اس کا مزاج ہی ایسا ہے۔ کسی نے کہا کہ حضرت جب آپ کی بیوی اتنی بدمزاج ہے تو آپ اس کو طلاق کیوں نہیں دے دیتے۔ چھوڑ دیجئے۔ اور کسی اور سے نکاح کرلیں۔ یہ دیکھئے اللہ والے طلاق دینے میں کتنا احتیاط برتتے تھے۔ فرمایا آپ نے یہ بات جو کہہ دی۔ اس میں کوئی مشکل تو نہیں لیکن تمہیں معلوم ہے کہ وہ عورت ہے تو جوان، میں اگر اسے طلاق دے دوں گا تو بہرحال کوئی نہ کوئی مسلمان اس سے شادی کر ہی لے گا۔ تو یہ عورت بجائے میرے اس کو جا کے ستائے گی۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنی خودغرضی کے لئے اپنی بلا کسی دوسرے مسلمان بھائی کے گلے ڈال دوں۔ فرمایا نہیں۔ اس عورت کے بدلے میں میرے گناہوں کو اللہ تعالیٰ نے معاف فرمایا ہے۔

ایک اور بات عرض کردوں۔ حضرت مولانا تھانوی رحمتہ اللہ علیہ طبیعت کے اعتبار سے نہایت حکیم بھی تھے۔ ظریف بھی تھے۔ کبھی کبھی فرماتے تھے کہ وعظ میں ایسی بات منہ سے نکل جاتی ہے کہ عورتیں آ کے کہتی ہیں کہ یہ آپ نے کیا کیا، مرد تو ہمارے سروں پر چڑھ جائیں گے۔ اور کبھی کبھی مرد یہ کہتے تھے کہ حضور یہ آپ نے کیا وعظ میں کہہ دیا۔ عورتیں تو ہمارا ناک میں دم کردیں گی۔

تو فرمانے لگے کہ ایک جگہ ایسا ہوا کہ میں نے وعظ میں یہ بیان کیا کہ بچے کو دودھ پلانا عورت کی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اپنے شوہر کی اولاد کو یا بچے سے محبت کرتے ہوئے دودھ پلاتی ہے لیکن شرعاً اس کی ذمہ داری نہیں، کسی دودھ پلانے والی کو رکھے۔ تو مولانا نے جو یہ وعظ میں فرمایا تو لوگوں نے یہ کہا، کہ مولوی صاحب اب تو ہر عورت بچے کو ہماری گود میں ڈالے گی کہ لو اپنا بچہ اس کے لئے بندوبست کرو۔ ہماری کوئی شرعی ذمہ داری نہیں۔ یہ تو مصیبت آ جائے گی۔ فرمایا کہ اچھا! انتظار کرو۔ اگلے دن جو وعظ ہوگا میں اس کی تلافی کردوں گا۔

اگلے دن وعظ میں مولانا نے یہ فرمایا کہ بیوی کے نان نفقہ کی ذمہ داری شوہر پر ہے لیکن اگر بیوی بیمار ہو جائے تو علاج کی ذمہ داری شرعاً شوہر پر نہیں ہے۔ تو مولانا نے فرمایا کہ اب اگر عورت کہے کہ بچے کو دودھ پلانے کا انتظام کرو۔ میری ذمہ داری نہیں۔ تو شوہر کہہ دے کہ بیمار ہوگی تو علاج کرانا میری ذمہ داری نہیں۔

قانون سے یہ تعلق نہیں چلتا ہے۔ یہ باہمی سمجھوتے سے چلتا ہے۔ باہمی محبت سے چلتا ہے۔ کتاب دیکھ دیکھ کر نہیں چلتا۔

بہر حال! حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات کے گھر تشریف لے جا رہے ہیں۔ لیکن صرف ایک ہفتہ باقی رہ گیا۔ کمزوری زیادہ ہوگئی، بیماری شدت اختیار کر گئی۔ آپؐ نے فرمایا آج کونسا دن ہے۔ آج کس کے گھر جانا ہے۔ آج کس کے گھر میں قیام کرنا ہے۔ ازواج مطہرات فراست سے یہ بات سمجھ گئیں کہ غالباً تکلیف چونکہ آپ کو بہت سخت ہے۔ اس تکلیف کے زمانے میں غالباً آپ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس گزارنا چاہتے ہیں۔

وہاں شاید آپؐ کو آرام ملے۔ ازواج مطہرات نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپؐ ہماری باری کا خیال نہ کریں۔ ہم خوشی سے عرض کرتی ہیں۔ اگر آپؐ کو حضرت عائشہ صدیقہؓ کے مکان پر آرام ملے تو ہم سب اپنی باری کو چھوڑنے کو تیار ہیں۔ اور انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم خود خدمت کے لئے حضرت عائشہؓ کے مکان پر حاضر ہو جایا کریں گی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مکان پر تشریف لے آئے۔ یہاں بیماری اور شدید ہو گئی۔ اور یہی وہ موقع ہے کہ جب آپ نے امامت کے لئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مصلی حوالہ کر دیا فرمایا کہ نماز ابوبکر پڑھائیں گے۔ صرف ایک دن اور یہ تقریباً آخری دن ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پردہ ہٹا کر دیکھا، نماز ہو رہی ہے، آپؐ کے چہرے پر تبسم تھا۔ اس دوران آپ کی طبیعت میں قدرے افاقہ ہوا ہے اور آپ منبر پر تشریف لائے۔ مسلمانوں کو کچھ کلمات پند و نصیحت کے طور پر وعظ کے طور پر فرمائے اور حجرے میں تشریف لے گئے۔ پیر کا دن ہے۔ ربیع الاول کی ۱۲ تاریخ ہے صبح کے وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لائے دیکھنے کے لئے آپ کی طبیعت ٹھیک تھی۔ بخار اتر گیا اور عام طور پر یہ تصور کر لیا گیا کہ آپ کی طبیعت بالکل ٹھیک ہو گئی اور کچھ قدرت کی طرف سے نظام ایسا ہے کہ جب آخری وقت آتا ہے تو بیماری ختم ہو جاتی ہے اس کا نام ہے سنبھالا۔ سنبھالنے کے معنی یہ ہیں کہ بیماری تو ختم ہو گئی ہے لیکن جس کے اوپر بیماری ہے وہ بھی چند لمحوں کے مہمان ہیں۔

دیکھنے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ بیماری کے آثار ختم ہو گئے، حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی مطمئن ہو گئے اور صحابہ بھی مطمئن ہو گئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اب آپؐ کی طبیعت ٹھیک ہے۔ اجازت ہو۔ ایک میل کے فاصلے پر ان کا گھر ہے۔ وہاں پر جانا چاہتے ہیں۔ اجازت دے دیجئے۔

ادھر چاشت کا وقت آیا۔ بعض روایتوں میں یہ ہے کہ زوال کا وقت شروع ہوگا۔ چاشت اور زوال میں کچھ فرق نہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر نزع کی کیفیت شروع ہو گئی۔ ازواج مطہرات سب

آپؐ کے پاس موجود ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ میں یہ خواہش رکھتی تھی کہ میں اللہ سے یہ دعا مانگوں گی کہ اے اللہ موت کے وقت میرا نزع آسان ہو لیکن میں نے جب یہ دیکھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نزع بڑا شدید اور بڑا سخت تھا۔ یہ ارادہ چھوڑ دیا کہ اب میں اس کی دعا نہیں مانگوں گی۔ میں کون ہوں دعا مانگنے والی۔ اتنے میں میرے بھائی حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ تشریف لائے۔ ان کے ہاتھ میں مسواک تھی۔ حضرت اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں۔ میں نے پوچھا آپؐ کیا مسواک کریں گے۔ انہوں نے فرمایا کہ ہاں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے یہ سمجھ کر کہ حضورؐ کمزور ہیں۔ میں نے خود اپنے منہ میں اس مسواک کو چبایا اور چبا کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی۔ آخری عمل آپؐ کا مسواک تھا۔ علماء نے لکھا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل مسواک ہے۔ اس سے ایک بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ جو مسلمان مسواک کی پابندی اختیار کرتا ہے۔ مرتے وقت اس کی زبان پر اسلام کا کلمہ ہوگا۔

اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے یہ بھی فرمایا کہ یہ فخر بھی مجھے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا کہ میرا لعاب دہن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لعاب دہن کے ساتھ آخری وقت میں اس طریقے سے کہ میں نے مسواک چبا کر حضورؐ کو دی ہے۔ یہ شرف بھی اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمایا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے آغوش میں ہے اور اسی حالت میں آپؐ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

جب یہ خبر پھیل گئی تو بعض لوگوں کی زبان پر یہ جملہ آیا کہ جن میں سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہیں۔ خدا کی قسم! اگر کسی شخص نے یہ کہا کہ ہمارے پیغمبر کی موت واقع ہو گئی ہے تو میں اس تلوار سے اس کی گردن کاٹ دوں گا۔ آپؐ کی روح کہیں تشریف لے گئی ہے۔ واپس آئے گی۔ میں سننا نہیں چاہتا کہ کوئی شخص یہ کہے کہ آپؐ کا انتقال ہو گیا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لائے اور امت میں ابوبکر صدیق سے بڑھ کر کوئی عاشق نہیں۔ لیکن عشق اور محبت ہائے وائے کا نام نہیں جو لوگ یہ کہتے ہیں فلانے کو

حال آ گیا۔ اور اس حال کی حقیقت بھی معاف کیجئے یہی ہے کہ سننے والا خود سمجھتا نہیں کہ کہنے والے نے کیا کہا اور حال آ جاتا ہے۔

ایک قوال یہ پڑھ رہا تھا کہ ؎

بیکارم و باکارم چوں مد بہ حساب اندر — این طرفہ تماشہ بین دریا بہ حباب اندر

ایک صاحب کو حال آ گیا۔ کسی نے پوچھا بھئی کس بات پر حال آیا کہنے لگا میں یہ سوچ رہا تھا کہ دریا بہ حباب اندر کہ جب بندر دریا میں نہار ہا ہو گا تو کیا مزہ آ رہا ہو گا۔ ارے ظالم، قوال نے تو دریا بہ حباب اندر کہا ہے تجھے اس بات پر حال کیسے آ گیا۔ یہ سب کچے لوگ ہیں۔

پکے لوگ وہ ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لائے۔ حضورؐ کے چہرے مبارک سے چادر ہٹائی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو زندگی بھی طیب عطا فرمائی۔ موت بھی طیب عطاء فرمائی۔ اللہ تعالیٰ میرے نبی پر دو موتیں جمع نہیں فرمائیں گے۔

ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ باہر تشریف لائے، عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا بازو پکڑا، کہا۔ آپ بیٹھئے میں آپ کو بتاتا ہوں۔ مسلمانوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ۔

ان کنتم تعبدون محمداً فان محمداً قدمات ۔ اے مسلمانو! اگر آج تک تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پرستش کرتے تھے تو تمہارے معبود رخصت ہو گئے عبادت بھی ختم ہو گئی۔ **فان کنتم تعبدون اللہ** اور اگر تم اللہ کی عبادت کرتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم عبادت کا طریقہ بتلانے کیلئے تشریف لائے تھے **فان اللہ حی قیوم لا یزال** تو اللہ بھی زندہ ہے۔ تمہاری عبادت بھی زندہ ہے۔ تمہاری ذمہ داری بھی زندہ ہے۔

پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین اور دفن کا سوال تھا۔ جب یہ گفتگو آئی کہ آیا غسل کے لئے آپؐ کے کپڑے اتارے جائیں یا نہ اتارے جائیں۔ تو یہ لکھا ہے کہ اس وقت ایک غنودگی سی سب کے اوپر طاری ہو گئی اور آواز آئی کہ لباس نہ اتارا جائے۔ اور اسی طرح آپؐ کو غسل دیا گیا۔ اس کے بعد آپؐ کو کفن دیا گیا پھر سوال یہ پیدا ہوا کہ کس طرح پر آپؐ کو دفن کیا جائے۔ کس طریقے پر آپؐ کا نماز جنازہ ہو۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھ سے حضورؐ نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ نبی کی وفات

جس جگہ ہوتی ہے۔ اسی جگہ غسل دیا جاتا ہے۔ اسی جگہ قبر کھودی جاتی ہے۔ اسی جگہ دفن کیا جاتا ہے۔ اور مزید فرمایا کہ جب میرا جنازہ تیار ہو جائے تو اسی حجرے کے اندر کہ جس میں میری وفات ہوئی ہے۔ جنازہ رکھ کے سب باہر آ جائیں کیونکہ سب سے پہلے جبرئیل امین آ کر میرے جنازہ کی نماز پڑھیں گے۔ ملائکۃ اللہ اور فرشتے جنازے کی نماز پڑھیں گے۔ پھر مسلمان مردوں کو جنازے کی نماز پڑھنی چاہئے پھر عورتوں کو۔ پھر بچوں کو اور نماز کا طریقہ یہ ہوگا کہ ہر شخص جائے گا اور جا کر تکبیر کہے گا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے گا۔

صلوٰۃ وسلام اور درود شریف پڑھ کر واپس آ جائے گا۔ یہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جنازے کی نماز تھی۔ امامت کے ساتھ، جماعت کے ساتھ آپؐ کی نماز جنازہ نہیں ہوئی۔ پھر تیسرے روز چہار شنبہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی حجرے کے اندر جو درحقیقت حضرت عائشہ صدیقہؓ کا مکان ہے اسی میں آپ کو دفن کیا گیا اور اسی میں آج تک آپ آرام فرما رہے ہیں۔

اور علماء نے یہ لکھا ہے کہ ہم اور آپ جو نماز جنازہ پڑھتے ہیں وہ نماز جنازہ کی صورت ہے اور نماز جنازہ کی جو حقیقت ہے وہ ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ادا کی گئی۔ نماز جنازہ کو نماز تو کہتے ہیں وہ تو نماز ہے ہی نہیں۔ رکوع نہیں سجدہ نہیں سورۃ فاتحہ نہیں۔

اور کوئی سورۃ نہیں۔ بلکہ مغفرت کی دعا مانگی جاتی ہے۔ درود شریف پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد سلام پھیر دیا جاتا ہے تو فرمایا کہ یہ حقیقت صلوٰۃ جنازہ ہے ہر ہر مسلمان جائے گا اسی طرح تیس ہزار مسلمان مرد عورتوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جنازہ پڑھی۔

بہر حال سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے یہ آخری لمحات تھے۔ یہ آپ کے وصال کے حالات تھے۔ اب دعا کیجئے۔

مشتاق احمد عفی عنہ مترجم
صوبائی اسمبلی صوبہ سرحد پشاور

صبر وتقویٰ

اَلحَمدُ لِلّٰہِ نَحمَدُہٗ وَنَستَعِینُہٗ وَنَستَغفِرُہٗ وَنُؤمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیہِ وَنَعُوذُ بِاللّٰہِ مِن شُرُورِ اَنفُسِنَا وَمِن سَیِّاٰتِ اَعمَالِنَا مَن یَّھدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضلِلہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشھَدُ اَن لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحدَہٗ لَا شَرِیکَ لَہٗ وَنَشھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَولَانَا مُحَمَّدًا عَبدُہٗ وَرَسُولُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیرِ خَلقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصحٰبِہٖ اَجمَعِینَ.

اَمَّا بَعدُ! فَاَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ.

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ.

صبر و تقویٰ

حضرات علماء کرام، بزرگان محترم اور برادران عزیز!

مجھے آج آپ کے اس مشہور شہر میں حاضر ہو کر اور آپ سب حضرات سے ملاقات کر کے بڑی خوشی ہوئی اور میں خاص طور پر انجمن نقیب الاسلام (لندن) کا ممنون ہوں۔ کہ انہوں نے میرے لئے یہ موقع فراہم کیا کہ میں حاضر ہو کر آپ سے دین کی باتیں کر سکوں۔

اس موقع پر کونسی بات آپ کی خدمت میں پیش کی جائے۔ یہ ہر اس شخص کے لئے کہ جس کو کبھی خطاب کرنے کا موقع ملتا ہے۔ جس کو کبھی تقریر کا اور بیان کا موقع ملتا ہے۔ یہ بات بہت مشکل اور بہت دشوار ہے۔

ایک تو اس وجہ سے کہ شریعت اسلامیہ اور دین اسلام اس حسین مجسمہ کی طرح ہے کہ جس کی ہر ادا یہ دعوت دیتی ہے کہ میری طرف متوجہ ہو کر مجھے دیکھو میرے اندر کیا کیا خوبیاں اور کیا کیا کمالات اور کیسے کیسے حسن ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایک مجلس میں کسی ایک ہی پہلو کی طرف کسی ایک ہی عضو کی طرف توجہ کی جا سکتی ہے۔ کسی فارسی شاعر نے اپنے محبوب کی تعریف کی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ تعریف در حقیقت اسلام کی ہے۔ فرمایا کہ۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم

فرق کے معنی آتے ہیں مانگ

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

ہر ادا مجھے متوجہ کر رہی ہے اور دعوت دے رہی ہے کہ تم میری طرف متوجہ ہو جاؤ لیکن بعض اوقات انتخاب میں بھی مشکلات اور دشواریاں ہوتی ہیں۔

ایک کتاب ہے جس کو لوگ الف لیلیٰ کہتے ہیں وہ غلط ہے۔ یہ الف لیلیٰ ہے۔ الف کے معنی ہیں ہزار، لیلیٰ کے معنی ہیں رات۔ ایک ہزار راتوں کی ایک ہزار الگ الگ کہانیاں ہیں۔ وہ کتاب الف لیلیٰ کے نام سے مشہور ہے۔ اور اصل کتاب وہ عربی میں ہے۔ اس

میں ایک یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک شخص سند باد سیاح، سیاحت کے لئے نکلا اور دنیا میں اس نے سیاحت کی، ملکوں کو دیکھا۔ عجائبات کو دیکھا۔ اور ایک کافی مدت خرچ کر کے پھر واپس ہونے لگا۔ جب وہ واپس جا رہا تھا تو اس کو جنگل میں بہت دور ایک سفید سی چیز نظر آئی۔ اس نے یہ سوچا کہ غالباً یہ کسی بادشاہ کا، کسی حاکم کا محل ہے۔ اور میں نے جب اتنا وقت سیاحت میں خرچ کیا ہے۔ تو چلو میں اس بادشاہ سے بھی ملاقات کرتا چلوں۔

سند باد سیاح کہتا ہے کہ میں جتنا جتنا قریب ہوتا چلا جاتا تھا۔ وہ جگہ بڑی ہو کر مجھے نظر آ رہی تھی۔ اور میں یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ کسی بادشاہ کا محل ہے۔ جب میں اس کے قریب پہنچا اور مجھے اس بات کی تلاش ہوئی کہ اس کا پھاٹک کونسا ہے۔ اس کا صدر دروازہ کونسا ہے۔ اس میں داخلے کی جگہ کیا ہے۔ تو چکر کاٹتے کاٹتے میں تھک گیا۔ مجھے کوئی دروازہ نہیں ملا۔

میں پریشان کہ یا اللہ! یہ اتنا بڑا محل نظر آ رہا ہے لیکن اس میں داخل ہونے کا راستہ کونسا ہے۔ یہ مجھے نہیں معلوم۔ ایک راہگیر سے پوچھا کہ میاں یہ تو بتاؤ کہ اس محل میں داخل ہونے کا راستہ کونسا ہے۔ اس نے ہنس کر کہا۔ آپ یہاں اجنبی مسافر معلوم ہوتے ہیں۔ اس نے کہا کہ ہاں میں مسافر ہوں اس نے کہا کہ حضور والا! آپ کو بڑی غلط فہمی ہے یہ کسی بادشاہ کا محل نہیں ہے۔ جو آپ اس میں دروازہ تلاش کر رہے ہیں۔ یہ تو سیمرغ کا انڈہ ہے اس میں دروازہ کہاں۔ اس میں کوئی کھڑکی کہاں۔ لہٰذا آپ کی یہ کوشش بیکار ہے اس کو بڑی مایوسی ہوئی اور وہ یہ سمجھ گیا کہ میں نے جتنی کوشش کی تھی۔ وہ غلط کوشش کی تھی۔

آج ایک خطیب کے لئے ایک عالم کے لئے سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میں دین کی کونسی بات کہوں اور کس دروازے سے دل و دماغ میں پہنچا دوں۔ کس طریقے سے دلوں میں دماغ میں اتار دوں۔

لیکن ساری عمر کی کوشش کے بعد حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ بھئی میں نے ۴۰ سال تک قبرستان میں اذان دی ہے۔ کوئی مردہ اٹھا نہیں۔ یعنی ایک طویل تجربے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ساری کی ساری ملت اور

ساری قوم جو ہے۔ یہ تو سیمرغ کا انڈا بنی ہوئی ہے۔ اس میں داخل ہونے کا نہ کوئی پھاٹک ہے۔ نہ کوئی دروازہ ہے۔ کیسے داخل ہوں۔

لوگ کہتے ہیں کہ مولانا آخرت وآخرت کی باتیں تو پھر کریں گے یہ بتایئے کہ پیٹ کی کوئی بات ہو۔ ایسا کوئی نسخہ بتایئے کہ جس سے ہماری دولت وثروت میں اضافہ ہو۔ جو ہمارے پیٹ کے مسائل سے متعلق ہو ایسی کوئی بات کہیئے۔ یہ راستہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا نہیں ہے۔ اور جو لوگ تبلیغ کے لئے ایسا راستہ اختیار کرتے ہیں انہیں بعد میں شرمندگی ہوتی ہے۔

کسی مولوی صاحب نے کسی بستی میں جا کر یہ کہا تھا کہ بھئی ۴۰ دن تک تم پابندی سے نماز پڑھو اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ تمہیں بھینس دیں گے۔ گاؤں والے نے کہا کہ ۵۰۰/ ۷۰۰ روپے میں خرچ کروں اس سے بہتر ہے ۴۰ دن نماز پڑھوں۔ بھینس مل جائے گی۔ اس نے پابندی کے ساتھ نماز پڑھی اور جب یہ دیکھا کہ دن قریب آنے لگے تو اس نے بھینس باندھنے کی جگہ بھی بنالی۔ کونٹھا بھی گاڑ دیا۔ رسی بھی لا کے رکھی اور جب ۴۰ دن ہو گئے تو یہ انتظار کرنے لگا۔ مولوی صاحب آئے اور ان سے کہا کہ صاحب ۴۰ دن ہو گئے۔ بھینس کہاں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ ارے بے وقوف میں نے تو یہ اس لئے کہا تھا کہ اگر تو ۴۰ دن تک پابندی کرے گا، تو تو نماز کا عادی ہو جائے گا۔ تجھے کوئی بھینس تھوڑی ملتی تھی۔ اس نے کہا میں تو تب ہی سمجھ گیا تھا کہ آپ کا وعدہ سچا نہیں ہے۔ میں نے بھی بلا وضو ہی پڑھی ہے۔

تو میرے عرض کرنے کا منشاء یہ ہے کہ یہ مسئلہ بھی بڑا اہم ہے۔ کیا بات کہنی چاہئے۔ کونسی بات کہی جائے۔

میں نے قرآن کریم کی چند آیتیں تلاوت کی ہیں۔ مجھے پڑھنی تو ایک ہی آیت چاہئے تھی لیکن ایک صاحب نے پرچہ لکھ کر بھیجا تھا کہ کچھ تلاوت لمبی کی جائے۔ قرآن کریم کا یہ ایک پورا رکوع ہے۔ اس رکوع میں ایک واقعہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔

قرآن کریم ۳۰ سپاروں کی کتاب ہے۔ اگر مضامین کے اعتبار سے اس کو اگر آپ تقسیم کریں تو یہ ۳ حصوں پر مشتمل ہو جاتا ہے۔

ایک حصہ قرآن کریم کا وہ ہے جس میں حلال وحرام، جائز وناجائز کے احکام نہیں ہیں۔

صرف جزاء وسزا، آخرت، قیامت اور مناظر قیامت کا ذکر ہے۔ اور کوئی حکم شریعت کا اس کے اندر بیان نہیں کیا گیا ہے۔ لمبی لمبی سورتیں قرآن کریم کی ہیں مگر کوئی حکم ان میں نہیں ہے۔ صرف آخرت کا بیان ہے۔

اور قرآن کریم نے جو طرز اور طریقہ تعلیم کا اختیار کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دین اللہ کا دین ہے۔ کیوں!

بمبئی سے ایک اخبار نکلتا تھا ''ہریجن اخبار'' اور وہ گاندھی جی کا آرگن کہلاتا تھا۔ اس میں ایک ہندو نے یہ مضمون لکھا کہ مسلمانوں کے اندر یہ بات مشہور ہے کہ مسلمانوں کی گھٹی میں شراب پڑی ہوئی تھی اور ایک حکم قرآن کریم میں آیا ہے کہ شراب حرام ہوگئی۔ نہ کسی پولیس کی ضرورت پڑی، نہ فوج کی ضرورت پڑی، لوگوں نے شراب کے برتن بھی توڑ دیئے۔ اور شراب نالیوں کے اندر بہادی۔ اس نے کہا ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ ہم دیکھتے ہیں۔ صبح سے شام تک حکومتیں ہمیں احکام دیتی ہیں۔ لیکن اس طرح پر تو کوئی بھی عمل نہیں کرتا۔ یہ مسلمانوں نے کہانی گھڑی ہے کہ اس طریقے سے جب حکم آیا تو شراب نالیوں میں بہادی گئی۔

یقین نہ آنے کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے کی حکومتیں حکم دیتی ہیں اور اس حکم پر عمل کرنے کا ذہن نہیں پیدا کرتیں۔ جب تک کسی قوم کا ذہن ان احکام کے اور ان قوانین کے مطابق نہ بنا دیا جائے۔ وہ قوم ان احکام اور قوانین پر کبھی عمل نہیں کر سکتی اور اگر ذہن بنا دیا جائے تو صرف حکم دینے کی دیر ہوتی ہے۔

اسلام نے جو طریقہ اختیار کیا وہ نہایت حکیمانہ طریقہ ہے۔ سب سے پہلے نماز کا حکم نہیں روزے کا حکم نہیں۔ زکوٰۃ کا حکم نہیں۔ جہاد کا حکم نہیں۔ حج کا حکم نہیں۔ سب سے پہلے قرآن کریم کی جو آیتیں نازل ہو رہی ہیں وہ انسانوں کو یہ بتا رہی ہیں جو کچھ تم دنیا میں کر رہے ہو۔ اس کا ردعمل اور اس کا نتیجہ آخرت میں نکلنے والا ہے۔

سب سے پہلے قرآن کریم نے انسانوں کا ذہن بنایا ہے۔ احکام جو بھی تمہیں دیئے جائیں گے وہ بعد میں آئیں گے لیکن یہ یاد رکھنا کہ جو کچھ اس دنیا میں کرو گے۔ یہ خالی نہیں

جائے گا اس کے نتائج آخرت کی زندگی میں ظاہر ہونے والے ہیں۔ اور قرآن کریم کی بڑی بڑی سورتیں نازل ہوئیں۔ جن میں مناظر قیامت بیان کئے گئے۔ ان کے اندر جزاء و سزا بیان کی گئی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم نے سب سے پہلے ذہن پیدا کیا۔ شراب گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ مگر قرآن کریم نے ایسا حکیمانہ طرز اور طریقہ اختیار کیا کہ ۳ منزلیں اور ۳ درجے اس کے لئے اختیار کئے۔

پہلی منزل پر ذہن بنایا، دوسری منزل پر ذہن بنایا، پھر تیسری منزل پر حکم آیا جس میں سب سے پہلے قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی فرمایا کہ۔

یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیھما اثم کبیر ومنافع للناس.

آپ سے لوگ شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ اس میں کچھ فوائد بھی ہیں۔ اور اس میں نقصانات بھی ہیں۔ لیکن اس کا جو نقصان ہے۔ وہ اس کے فائدے سے زیادہ ہے۔ دنیا میں کوئی چیز آپ کو ایسی نہیں ملے گی کہ جس میں کوئی نہ کوئی جزوی طور پر فائدہ نہ ہو۔ کوئی چیز اللہ نے ایسی پیدا نہیں کی۔ لیکن شریعت یہ دیکھتی ہے کہ اس میں فائدے کی مقدار زیادہ ہے یا اس میں نقصان کی مقدار زیادہ ہے۔ قرآن کریم نے کہا کہ اس میں کچھ فوائد بھی ہوں گے لیکن اس میں نقصانات زیادہ ہیں۔ صرف اتنی سی بات آئی۔

مسلمانوں نے یہ اندازہ لگا لیا کہ یہ چیز اللہ کی نظر میں شاید پسندیدہ نہیں ہے اتنا ذہن بن گیا۔ دوسری مرتبہ قرآن کریم میں حکم آیا۔

یا ایھا الذین امنوا لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ

نماز، اللہ کے دربار میں حاضری کا نام ہے اور حدیث میں آتا ہے کہ جب کوئی بندہ نماز میں سجدہ کرتا ہے تو بندے کا سر اللہ کے قدموں میں ہوتا ہے فرمایا کہ جب نماز کے لئے آؤ تو حالت نماز میں شراب مت پینا۔ اس عبادت کی حالت میں یہ کیفیت اللہ کو پسند نہیں ہے۔

ابھی حرام ہونے کا حکم نہیں آیا۔ جب دوسری منزل پر بھی ذہن بن گیا۔ پھر تیسری منزل پر یہ حکم آیا۔ فرمایا کہ

انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطن فاجتنبوہ لعلکم تفلحون.

یہ وہ آیت تھی قرآن کریم کی کہ جس نے شراب کو صرف حرام ہی نہیں قرار دیا ہے بلکہ اس کو بدترین قسم کا گناہ اور نہایت پلید اور ناپاک قسم کا عمل بتایا ہے۔ یہ میں نے اس لئے کہا کہ ہمارے بعضے دوست فرمایا کرتے ہیں کہ مولانا شراب کے بارے میں کہیں لفظ حرام تو موجود نہیں ہے قرآن مجید میں۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ جب لفظ حرام قرآن مجید میں نہیں ہے تو آپ حرام کیوں کہتے ہیں۔

ہم میں سے اور آپ میں سے بہت سے لوگ بھولے بھالے ہیں۔ واقف نہیں ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہوں گے کہ یقیناً یہ کوئی کمی اور کمزوری کی بات باقی رہ گئی ہے۔ لیکن نہیں یہ بات صحیح نہیں ہے۔

اگر ممانعت کی بنیاد یہی ہے کہ لفظ حرام سے منع کیا جائے۔ تب تو حرام ہے۔ ورنہ حرام نہیں ہے۔ یہ آپ مجھے لکھ کر دے دیں اور جب آپ مجھے لکھ کر دے دیں گے تو اب میں آپ سے یہ پوچھوں گا کہ زنا حرام ہے یا نہیں۔ آپ کہیں گے کہ حرام ہے میں قرآن کریم کے تیس سپاروں کے بارے میں آپ کو چیلنج کر کے بتاتا ہوں کہ کہیں کوئی آیت قرآن کریم کی ایسی ہے کہ جس میں زنا کو حرام کہا گیا ہو؟ کہیں موجود نہیں۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ بنیاد آپ بنالیں کہ لفظ حرام ہو تو حرام ہے اور اگر لفظ حرام نہ ہو تو حرام نہیں تو چلئے شراب آپ لوگوں نے حلال کر دی زنا کے بارے میں میں کہہ دیتا ہوں کہ یہ بھی حلال ہے۔ کیونکہ لفظ حرام سے منع نہیں کیا گیا۔ چلنا مشکل ہے آپ کے لئے۔ بہت سے لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ مولانا یہ داڑھی رکھنے کے لئے جو آپ فرماتے ہیں تو قرآن میں کہاں موجود ہے۔ ہم نے کہا کہ اچھا بھئی قرآن میں موجود نہیں اور جو قرآن میں موجود نہیں ہے وہ قابل عمل نہیں ہے۔ تو آپ لوگ اپنی اولاد کی ختنہ کیوں کراتے ہیں وہ بھی تو قرآن میں کہیں موجود نہیں ہے۔

میں یہ بات اس لئے عرض کر رہا تھا کہ لوگوں کے اندر یہ بڑی غلط فہمی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ لفظ حرام قرآن کریم کے نازل ہونے کے ایک سو سال بعد جب اسلامی قانون بنایا گیا۔ جب اسلامی فقہ بنایا گیا۔ تو یہ قانون کی ایک اصطلاح ہے۔ یہ قرآن کریم کی زبان نہیں۔ بلکہ جن جن چیزوں کو قرآن کریم نے منع کیا ہے اور منع کرنے

کے الفاظ جو بھی ہوں، ان چیزوں کو قانون کی زبان میں حرام کہا جاتا ہے۔

اس کی ابتداء کیسی ہوئی! ابتدائے اسلام میں سب لوگ اسلام پر عمل کرتے تھے۔ ایک زمانہ ایسا آیا کہ کچھ کچھ چیزیں ہم سے چھوٹنے لگیں مثال کے طور پر تہبند باندھتے تھے اس کی جگہ پاجامہ پہننے لگے۔ یا اسی طریقے سے بعض اور سنتیں تھیں۔ ان کو ترک کیا۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ ایک مسلمان کی زندگی سے جو یہ اسلام کی باتیں کم ہوتی چلی جارہی ہیں۔ یہ باتیں بنیادی ہیں یا بنیادی نہیں ہیں۔ اگر یہ باتیں بنیادی ہیں تو اس مسلمان کی شہادت اسلامی عدالت میں معتبر نہیں۔ اور اگر یہ بنیادی نہیں ہیں۔ تو کوئی حرج نہیں۔ یہ فاسق نہیں کہلائے گا۔ اس کی شہادت ابھی تک اسلامی عدالت میں قابل قبول ہے۔ چنانچہ ان کے درجے قائم کیے گئے۔

اسلام میں جتنے کام کرنے کے ہیں وہ چار ہیں۔ اسلام میں جتنے کام نہیں کرنے کے وہ بھی چار ہیں۔

جو کام اسلام میں کرنا ضروری ہے اور وہ قرآن مجید سے ثابت ہے اس کو قانون کی زبان میں فرض کہتے ہیں۔ چاہے لفظ فرض موجود ہو یا نہ ہو۔ جیسے روزے فرض ہیں لیکن قرآن کریم میں لفظ فرض موجود نہیں ہے۔ فرمایا کہ **کتب علیکم الصیام** تم پر روزے لکھ دیئے گئے۔ فرض کا لفظ نہیں ہے۔

اور جو کام کرنا اسلام میں ضروری ہے مگر قرآن سے ثابت نہیں ہے۔ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور اس کا کرنا ضروری ہے۔ اس کا چھوڑنے والا بھی فاسق ہوتا ہے۔ اس کو قانون کی زبان میں واجب کہیں گے۔ اسی طریقے سے اگر کوئی عمل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور زیادہ تر آپ نے اس کی پابندی کی ہے۔ اس کو سنت کہیں گے۔

اور اگر آپ نے کبھی کبھی اسے چھوڑ بھی دیا ہے اور کبھی عمل کیا ہے اسے مستحب کہیں گے۔

اور اسی طریقے سے جن باتوں کو اسلام نے منع کیا ہے وہ چار ہیں۔ اگر وہ ممانعت قرآن کریم سے ثابت ہے اگرچہ حرام کے الفاظ نہ ہوں۔ ممانعت کے الفاظ ہوں، قتل کرنا، حرام، لفظ حرام قرآن کریم میں نہیں ہے۔ **ولا تقتلوا** کا لفظ ہے۔ زنا حرام، کیوں! ممانعت کے الفاظ یہ ہیں **ولا تقربوا الزنا انه کان فاحشة** عمل کرنے کا تو سوال ہی نہیں۔ یہ اتنی بری

چیز ہے کہ تم اس کے قریب بھی مت جاؤ۔ ممانعت ان الفاظ سے کی گئی ہے۔

شراب کی ممانعت ان الفاظ سے کی گئی ہے کہ یہ نجاست ہے۔ یہ گندگی ہے، یہ شیطانی عمل ہے، اس سے تم بچتے رہنا۔ اس سے تم الگ رہنا۔ قانون کی زبان میں یہ حرام کہلاتا ہے۔

اور جو ممانعت قرآن سے ثابت نہیں ہے۔ حدیث سے ثابت ہے اس کو مکروہ تحریمی کہتے ہیں۔

اور جو چیز ایسی ہے کہ اگر آپ چھوڑ دیں تو بہتر ہے۔ لیکن اگر کر لیا ہے تب بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کو کہیں گے مباح۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دھوکا دیا جاتا ہے کہ لفظ حرام موجود نہیں ہے۔ لفظ حرام کے معنی یہ ہیں کہ اس کی ممانعت قرآن کریم سے ثابت ہو۔ لہٰذا وہ حرام کہلائے گا۔

میں یہ بات عرض کر رہا تھا۔ ذہن بن گیا۔ اب جب قرآن کریم کی حرمت شراب کی آیت نازل ہوئی۔ وہ تمام کے تمام مسلمان کہ جو دو منزلوں پر اپنے ذہن بنا چکے تھے۔ انہوں نے شراب کو نالیوں میں بہا دیا۔ برتن اس کے توڑ دیئے اور پھر کبھی اپنے قریب نہیں آنے دیا۔

اس شخص (ہندو) کو یقین اس لئے نہیں آتا۔ وہ دنیا کے حکومتوں کے احکام اور قوانین دیکھتا ہے۔ حکومتیں احکام دیتی ہیں۔ اس کے مطابق قوم کا ذہن نہیں بناتی اسلام میں سب سے پہلے وہی آیتیں نازل ہوئیں کہ جن کے اندر انسانی ذہن بنایا گیا۔ یہ ۱۰ سپاروں کے برابر ہے۔

اور دوسرا مضمون قرآن کریم میں جو ۱۰ سپاروں کے برابر ہے۔ ان میں قصے کہانیاں، واقعات پیغمبروں کے بھی، قارون کے بھی، فرعون کے بھی، اور اللہ کے نیک اور برگزیدہ بندوں کے اور بندیوں کے بھی یعنی حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام۔ نبی نہیں ہے۔ صدیقہ ہیں۔ لیکن ان کے نام پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی ایک سورت نازل فرمائی۔ حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نام پر ایک سورت نازل فرمائی ہے۔ اس کا نام ہی سورہ یوسف ہے۔ جس میں حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کا واقعہ بیان کیا ہے۔

ہمارے بہت سے دوست حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے کو ایسے مزے لے لے کر پڑھتے ہیں جیسے کسی زمانے میں آپ نے دیکھا ہوگا ہیر رانجھا ہوتا تھا۔ بڑے لہجہ سے پڑھتے

ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ حضرت یوسف اور زلیخا کے عشق کا اور ان کی محبت کا واقعہ شاید اللہ تعالیٰ نے ہمارا دل بہلانے کے لئے نازل کیا ہے۔ حالانکہ جتنے قصے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائے ہیں ان کا مقصد کیا ہے۔ فرمایا کہ **لقد کان فی قصصهم عبرة لاولی الالباب۔**

قصہ کا مقصد ہے۔ سبق دینا۔ جتنی زبانوں میں بھی آپ اخلاق کی کتابیں پڑھیں گے آپ کو یہ بات معلوم ہوگی۔ اخلاق کی تعلیم قصوں سے دی جاتی ہے۔ اخلاق کی تعلیم کہانیوں سے دی جاتی ہے۔

علامہ اقبال کی کتابوں میں بھی آپ نے پڑھا ہوگا۔ پہاڑ اور گلہری۔ اتنا بڑا حکیم اتنا بڑا شاعر لیکن پہاڑ اور گلہری کا قصہ سنا رہا ہے۔ واقعہ ہو یا نہ ہو۔ کیوں! انسانوں کو سبق دینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کے سامنے کوئی واقعہ بیان ہو۔ سبق کتنا اچھا یاد ہے۔

انہوں نے یہ لکھا کہ ایک بڑے اونچے پہاڑ کے پاس ایک گلہری بیٹھی ہوئی اپنے دانتوں سے کچھ کتر رہی تھی۔ پھدک پھدک کے ادھر ادھر جا رہی تھی۔ پہاڑ نے یہ کہا ارے! میرے وجود کے سامنے تجھے شرم نہیں آتی کہ تو اتنی شوخیاں کر رہی ہیں۔ گلہری نے جواب دیا کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے مجھ سے بڑا وجود عطا فرمایا ہے اور آپ واقعی قابل تعظیم ہیں لیکن یہ کہ ہنر سے میں بھی خالی نہیں ہوں۔ کمال سے میں بھی خالی نہیں ہوں۔ یہ چھالیہ کا ٹکڑا میں کتر کے دکھاتی ہوں۔ آپ کا اتنا بڑا وجود ہے مگر آپ کتر نہیں سکتے۔ یہ کہانی سنائی! کیوں! آخر میں سبق دیا

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں ۔۔۔ کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

کسی کو حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھو۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مخلوقات ہیں۔ اور ہر مخلوق میں اللہ تعالیٰ نے کوئی نہ کوئی کمال رکھ دیا ہے۔ انسانوں کو غیرت اور خودداری کا سبق دیا۔ آپ نے شمع اور پروانے کا قصہ پڑھا ہوگا۔ آخر میں سبق دیا ہے۔

اللہ کا سو شکر کہ پروانہ نہیں میں ۔۔۔ دریوزہ گر آتش بیگانہ نہیں میں

میں کسی سے بھیک مانگنے کے لئے اپنے پیالہ نہیں پھیلاتا ہوں۔ مجھے اللہ نے خوددار بنایا ہے۔

قرآن کریم نے یہ قصے کیوں بیان کئے۔ یہ قصے اس لئے بیان کئے۔ ہم نے تم سے کہا دیکھو یہ زہر ہے یہ مت کھاؤ اور اگر تم باز نہیں آتے۔ چلو ہمارے سامنے ہسپتال کے اندر ایسی لاشیں پڑی ہوئی ہیں ہم تمہیں دکھا دیتے ہیں، جنہوں نے کھایا، وہ مر گئے۔ قوموں کے قصے اور واقعات اللہ تعالیٰ نے اس لئے بیان فرمائے ہیں کہ جن قوموں نے خدا کی مخالفت کی، جنہوں نے نبیوں کی مخالفت کی، جنہوں نے آخرت کی مخالفت کی۔ اس روئے زمین پر ان کا کیا حشر ہوا۔ یہ مری ہوئی قوموں کی لاشیں موجود ہیں۔ آؤ تم انہیں دیکھو اور دیکھ کے سبق حاصل کرو۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم نے کوئی قصہ اس لئے نہیں بیان کیا کہ آپ کی معلومات میں اضافہ ہو۔

ایک بات اور بیچ میں آگئی، ہمارے نوجوان جن کا اپنا ذہن نہیں۔ دوسروں سے مانگا ہوا ذہن ہے۔ ہمارے منہ سے عام طور پر وہ باتیں نکلتی ہیں، جو بات دوسرے کی ہوتی ہے زبان ہماری ہوتی ہے۔ فرمایا کہ

انہیں کی مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات ان کی
انہیں کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات ان کی

بعض لوگ سوچتے ہیں بائبل بڑی چھوٹی سی ہے۔ Pocket (پاکٹ) میں آجاتی ہے قرآن مجید کیوں اتنا چھوٹا نہ ہو کہ ہماری پاکٹ میں آجائے۔ اچھا یہ ایک ہزار جگہ پر حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ کیا ضرورت ہے سب جگہ سے نکال دو۔ ایک جگہ باقی رہنے دو۔ قرآن مجید مختصر ہو جائے گا۔ صبر کی آیتیں قرآن کریم میں 75 ہیں۔ کیا ضرور ہے۔ 74 نکال دو۔ ایک باقی رہنے دو اور جب آپ قرآن کریم کے یہ مکرر جز نکال دیں گے۔ تو قرآن چھوٹا ہو جائے گا ایسے بائبل کی طرح پاکٹ میں رکھنے کے قابل ہو جائے گا۔

حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی اچھی بات کہی ہے۔ فرمایا، آپ کے سوچنے کا انداز تو بہت اچھا ہے لیکن کبھی آپ نے اللہ تعالیٰ سے یہ کہا کہ اللہ میاں آپ نے دیکھنے کے لئے دو آنکھیں عطا فرمائی ہیں۔ اس فضول خرچی سے کیا فائدہ ایک واپس لے لو۔ ایک ہی سے دیکھا کریں گے اور جن لوگوں کے پاس ایک آنکھ ہے تو آپ کو معلوم ہے وہ

دنیا میں کیا غضب ڈھاتے ہیں دنیا میں ایک آنکھ والے مشہور ہیں۔ جن کو ایک آنکھ سے نظر آئے ایک آنکھ سے نظر نہ آئے۔ وہ ضرور کوئی نہ کوئی فتنہ پیدا کرے گا۔

ہمارے یہاں پاکستان میں ایک وزیر تھے۔ ان کی ایک آنکھ خراب تھی ان کے پاس Portfolio تھا وزارت داخلہ کا بھی امور کشمیر کا بھی۔ وہ تقریر کر رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ کشمیر نہیں حاصل کر سکتے جب تک کہ تم قربانی نہیں دو گے۔ تو ایک صاحب نے مجمع میں سے پکار کر کہا کہ وزیر صاحب! جناب والا! آپ بھی قربانی دیں گے یا نہیں۔ انہوں نے اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہا کہ سب سے پہلے میں قربانی دوں گا۔ انہوں نے کہا کہ علماء کا فتوی یہ ہے کہ آپ کی قربانی جائز نہیں آپ کی ایک آنکھ خراب ہے۔

ارے بھائی وہ آنکھ خراب ہونے کی قربانی تو بکریوں کے لئے ہے۔ تم نے جا کر وزیروں پر لگادی۔

خیر میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ نوجوان اللہ تعالیٰ سے کیوں نہیں کہتے کہ ایک آنکھ واپس لے لو۔ ایک سے دیکھیں گے۔ ایک کان واپس لے لو۔ بلکہ اس زمانے میں آپ یہ کہہ دیں تو زیادہ بہتر ہے کہ اللہ میاں آنکھ تو ایک بھی کام دے دے گی، آنکھ واپس لے لیجئے۔ اور آنکھ کے بدلے میں کچھ انگلیاں اور بڑھا دیجئے تا کہ ٹائپ کرنے میں ذرا آسانی ہو جائے۔

نہیں! قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قصے اگر ایک ہزار جگہ موجود ہیں۔ خدا کی قسم! ایک ہزار الگ الگ سبق دیئے گئے ہیں۔ صرف ایک ہی سبق نہیں دیا گیا۔ ایک جگہ سے بھی اگر آپ وہ حصہ الگ کر دیں گے تو ایک سبق ختم ہو گیا۔

بعض اوقات بات ایک ہوتی ہے اور نتیجہ اس سے بہت سے نکلتے ہیں۔ مثال کے طور پر میں ایک تاریخ کا جملہ نقل کرتا ہوں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں بیت المال میں زکوٰۃ جمع ہوتی تھی۔ اعلان ہوتا تھا کہ جو مستحق زکوٰۃ ہو وہ زکوٰۃ لے جائے۔ لیکن کوئی زکوۃ لینے والا نہیں تھا۔

میں اس سے آپ کو یہ سبق دینا چاہتا ہوں کہ زکوٰۃ انفرادی طور پر لوگ خرچ نہیں کیا کرتے تھے۔ اجتماعی طور پر بیت المال میں جمع کرتے تھے اس جملہ سے یہ بات نکل آئی۔

اس سے دوسرا سبق یہ ملتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی رعایا کی مسلمانوں کی تربیت اتنی اعلیٰ کی تھی کہ جو مستحق نہیں تھا، اس نے اپنے آپ کو مستحق زکوۃ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی آپ نے کتنی دیانت پیدا کی تھی۔

آج اگر آپ اعلان کر دیں کہ جو نابینا ہوگا میں اس کو لحاف تقسیم کر دوں گا نابینا ہو یا نہ ہو وہ آنکھیں بند کر کے لاٹھی لے کے چلا آئے گا تا کہ ایک لحاف تو مل جائے۔

اس جملہ سے ایک سبق یہ ملتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں مالیات کا نظام، اقتصادی نظام، معاشی نظام ایسا تھا کہ ان میں کوئی لکھ پتی اور کروڑ پتی بھی نہیں تھا اور کوئی فقیر بھوکا ننگا بھی نہیں تھا۔ انہوں نے اتنا توازن پیدا کیا تھا۔

ایک ہی جملے سے اتنے اسباق سامنے آئے۔ اسی طرح قرآن کریم ایک ہی واقعہ کو نقل کرتا ہے ایک جگہ ایک سبق دیتا ہے دوسری جگہ دوسرا سبق دیتا ہے۔ خیر تو میں یہ عرض کر رہا تھا قصے کا مطلب، آپ سمجھ گئے، دل بہلانا نہیں۔ آپ کی تاریخی معلومات میں اضافہ کرنا نہیں قرآن کریم تاریخ کی کتاب نہیں اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قصہ جو آخر عمر میں ہوا وہ پہلے موجود ہے جو پہلی عمر میں ہوا وہ آخر میں موجود ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کوئی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تاریخ تو بیان نہیں کر رہا ہے۔ وہ تو ان کی زندگی میں جو واقعات پیش آئے ہیں ان کے ٹکڑوں سے انسانوں کو سبق دیتا ہے۔

بہر حال یہ رکوع جو میں نے پڑھا ہے اس میں ایک قصہ اور ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر مسلم قوم اور ہمارے اندر وہ خصوصیتیں پیدا ہو جائیں اور زندہ ہو جائیں۔ جس کے لئے قرآن کریم نے ہمیں یہ واقعہ سنایا ہے میں سمجھتا ہوں، مسلم قوم دنیا میں پھر اس طریقے سے اپنا نام پیدا کریگی جو آج سے تیرہ سو سال پہلے مسلم قوم کی دھاک دنیا میں بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ قصہ کیا بتا رہا ہے۔ فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد اس قوم کے اندر ایک وقت آیا کہ جب جہاں پر قربانی دینے کا وقت آتا تھا۔ دین کے نام پر اللہ کے نام پر قربانی دینے کا وقت آتا تھا۔ یہ سب کے سب عافیت پسند ہو گئے آرام طلب، اپنے

گھروں میں گھس کے بیٹھ جاتے تھے۔

یہ جملہ یاد رکھئے ...... علماء نے لکھا ہے کہ جس قوم کو دنیا میں اپنے قومی نصب العین کی خاطر مرنا نہیں آتا، اس قوم کو دنیا میں جینے کا کوئی حق نہیں۔ جینے کا حق دنیا میں صرف اس قوم کو ہے کہ جو نصب العین کی خاطر جان کی قربانی دینے کو تیار ہو۔ عزت، حیات، سب ان قوموں کے لئے ہے۔

چنانچہ ایک زمانہ آیا حضرت شمویل علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جو نبی اور پیغمبر ہیں انہوں نے کہا، گرتے گرتے اتنے گر گئے ہو۔ اتنے گر گئے ہو۔

یہ جملہ اسی لندن کی پارلیمنٹ کا جملہ ہے جو چیمبر لین (وزیر اعظم) نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ہم گرتے گرتے اتنے گر گئے ہیں کہ اب نیچے گرنے کو بھی کوئی جگہ باقی نہیں رہی۔

حضرت شمویل علیہ السلام نے کہا تم اپنی ذلت اور پستی کو دیکھو، حد ہو گئی ہے اور یہ ذلت اور پستی عروج میں تبدیل ہو نہیں سکتی جب تک کہ اپنے اندر یہ حوصلہ پیدا نہ کرو کہ مقصد کی خاطر اور اللہ کی رضا کے لئے جان دینے کو تیار ہو جاؤ۔

قوم نے کہا "انہیں پکڑ کے جیل میں بند کر دو۔ حضرت شمویل علیہ السلام کو جیل میں بند کر دیا گیا۔ ایک ظالم باشادہ نے اس قوم پر حملہ کیا اور ایسا ذلیل کیا، ایسا ذلیل کیا کہ بیت المقدس خون سے بھر گیا۔ اس قوم یعنی بنی اسرائیل کے پاس ایک تبرک تھا اس کو کہتے تھے تابوت سکینہ! حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا تھا۔ مصلی تھا، توریت کا نسخہ تھا اور بنی اسرائیل یہ سمجھتے تھے کہ اب عمل کی تو ہمیں ضرورت نہیں، توریت کا کوئی حافظ نہیں، جہاں پر ضرورت پڑے گی صندوق سر پر اٹھا کے لے جائیں گے اور تابوت سکینہ کے ذریعے سے تبرک حاصل کر لیں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں اللہ کی کتاب سے تبرک بھی حاصل کیا جاتا ہے، اگر قرآن کریم کی آیت پڑھ کر کسی پر دم کیا جائے۔ تو کوئی شریعت کے خلاف نہیں اگر اس کا تعویذ کسی کے گلے میں ڈال دیا جائے تو دین کے خلاف نہیں۔ مگر سوال یہ ہے...... ایمانداری سے بتایئے ...... کہ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ قرآن کریم اسی لئے نازل فرمایا تھا کہ اگر ہمارے گھر میں کوئی بیمار ہوگا تو اس کو ورق کی

ہوادیا کریں گے۔اور ضرورت پڑے گی تو تعویذ لکھ لیں گے۔ضرورت پڑی تو دم کرادیں گے۔

کیا یہی مقصد ہے قرآن کریم کے نازل کرنے کا...... ہاں اگر قوم یہ سمجھتی ہے کہ قرآن کریم پر عمل بھی کرنا ہے۔ دنیا میں بھی نجات ہے اور آخرت میں بھی نجات ہے۔ عمل بھی کرتے ہیں پھر اگر آپ اوراق کا ہوا دے دیں...... الحمدللہ باعث برکت ہے۔ تعویذ بھی باعث برکت ہے پڑھ کے دم کریں باعث برکت ہے لیکن اگر صرف تبرک کا کام لیا جائے جیسے ہمارے یہاں لڑکیوں کی شادی ہوتی ہے تو قرآن کا ایک نسخہ دیتے ہیں کہ بھئی لڑکی کو قرآن پڑھایا بھی تھا یا نہیں۔ وہ کہتے ہیں جی پڑھایا تو نہیں تھا اچھا ہے الماری میں رہے گا کوئی جن بھوت گھر میں نہیں آئے گا۔

خیر میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اس ظالم بادشاہ نے بنی اسرائیل کو ذلیل کیا اور ان سے وہ تابوت سکینہ بھی اٹھا کر لے گئے اب بنی اسرائیل کے پاس نہ توریت ہے نہ عصائے موسیٰ ہے نہ مصلی ہے۔ کچھ نہیں۔ فرمایا کہ۔

فیہ سکینة من ربکم وبقیة مما ترک ال موسیٰ وال ھرون (۲:۲۴۸)

اب یہ قوم حضرت شمویل علیہ السلام کے پاس گئی اور جا کر کہا کہ اب ہم توبہ کرتے ہیں ہم نے یہ دیکھ لیا کہ جب تک ہم باہر نکلیں گے نہیں۔ مجاہدانہ خصوصیات پیدا نہیں کریں گے۔ اس وقت تک ہماری ذلت کے دن ختم نہیں ہوں گے۔ اب آپ پیغمبر ہیں ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ کسی لیڈر کا، کسی امیر کا انتظام کریں۔ تا کہ اس کے جھنڈے کے نیچے چل کر جمع ہو کر ہم جہاد کریں۔

اذ قالوا لنبی لھم ابعث لنا ملکاً نقاتل فی سبیل اللہ (۲:۲۴۶)

انہوں نے اللہ سے دعا کی یا اللہ یہ قوم اب شرمندہ ہے۔ اب تیری راہ میں جہاد کرنا چاہتے ہیں فرمایا کہ۔

قال ھل عسیتم ان کتب علیکم القتال الا تقاتلوا (۲:۲۴۶)

اس قوم کی تاریخ تو یہ بتا رہی ہے کہ جب بھی وقت آیا ہے۔ یہ گھروں میں گھس کے بیٹھ گئے ہیں۔ اب ہم کیسے یقین کریں کہ یہ لڑیں گے۔

قالوا وما لنآ الا نقاتل فی سبیل اللہ وقد اخرجنا من دیارنا وابنائنا (۲:۲۴۶)

یہ بات تو صحیح ہے لیکن اس سے زیادہ تو کوئی ذلت کا وقت نہیں آئے گا کہ ہم کو ہمارے گھروں سے ہمارے کان پکڑ کے نکال دیا گیا۔ باپ کو بیٹے سے جدا کر دیا بیٹے کو باپ سے جدا کر دیا گیا۔

وقد اخرجنا من دیارنا وابنائنا (۲:۲۴۶)

اب ایسا نہیں ہوسکتا......انہوں نے کہا بہت اچھا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت طالوت کو لیڈر مقرر کر دیا، بادشاہ مقرر کر دیا جب حضرت طالوت کو مقرر کر دیا تو یہ قوم کیا کہنے لگی! ہم نے یہ تو ضرور کہا تھا کہ ہم جہاد کے لئے تیار ہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ حضرت طالوت جو ہیں وہ ایک تو ہمارے قوم کے آدمی نہیں ہیں اور **ولم یؤت سعة من** دو خرابیاں ہیں طالوت میں۔ ایک تو خاندانی طور پر ہمارا آدمی نہیں۔ دوسرا یہ کہ یہ آدمی غریب ہے۔ اس کے پاس دولت نہیں ہے۔ ہم ایسے آدمی کی اطاعت کیسے کریں جو ہمارے خاندان کا نہیں اور جو اتنا غریب ہے۔

قال ان اللہ اصطفه علیکم وزادہ بسطة فی العلم والجسم الخ

اب وہ بات آ رہی ہے جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو دو جواب دیئے ہیں۔ ایک حاکمانہ، ایک حکیمانہ......قرآن کریم کا طرز حکیمانہ بھی ہے حاکمانہ بھی ہے اللہ تعالیٰ حکیم بھی ہے، احکم الحاکمین بھی ہے۔

حکیمانہ جواب یہ ہے، دیکھو میاں! جس بات میں تم اختلاف کر رہے ہو وہ اختلاف کی بات نہیں ہے۔ تم یہی تو کہہ رہے ہو کہ تم نے طالوت کو مقرر کر دیا، یہ ہمارے خاندان کا نہیں اور یہ غریب ہے۔ تو یہ بتاؤ کہ جس کو بادشاہ مقرر کیا جائے کیا اس میں خاندان کا ہونا بھی ضروری ہے کیا اس میں یہ ہونا بھی ضروری ہے کہ وہ دولت مند ہو۔ یہ تمہارا خیال غلط ہے تم یہ اعتراض چھوڑ دو بلکہ جس کو مقرر کیا جاتا ہے۔ اس میں دو صلاحیتیں ہوتی ہیں اور طالوت میں دونوں صلاحیتیں موجود ہیں۔

ان اللہ اصطفه علیکم وزادہ بسطة فی العلم والجسم.

ایک یہ کہ اس کو حکمرانی کا طریقہ معلوم ہے۔ سیاست سے واقف ہے، اس کے پاس علم ہے اور دوسرا یہ کہ قوم کے اندر اس کا وقار ہے قوم اس کی عزت کرتی ہے تو حاکم بنانے کے لئے تو یہ دو Qualification کی ضرورت تھی اس لئے ہم نے اس کو مقرر کیا۔ وہی مناسب تھا۔

یہ تو اللہ تعالیٰ نے پیار کر کے، محبت سے سمجھایا۔ آگے حاکمانہ جواب سنئے۔

و اللہ یؤتی ملکہ من یشآء و اللہ واسع علیم.

اللہ تعالیٰ نے طالوت کو جو سلطنت دی ہے کیا تمہاری جیب سے چھین کر دی ہے کیا تمہاری ملکیت ہے...... یہ اللہ تعالیٰ کی حیثیت ہے کہ جس کو چاہتا ہے صاحب سلطنت بناتا ہے جس کو چاہتا ہے اقتدار دیتا ہے۔ خبردار جو تم نے اعتراض کیا تمہیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔

و اللہ یوتی ملکہ من یشآء

طالوت بادشاہ مقرر ہو گئے۔ اب یہ قوم روانہ ہوئی ہے جہاد کے لئے طالوت کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر یہ قوم لڑنے کے لئے جا رہی ہے۔ فرمایا۔

ان اللہ مبتلیکم بنھر.

آگے ایک نہر آ رہی ہے پانی کی وہاں تمہارے دو امتحان ہوں گے۔

بس میں یہی کہنا چاہتا تھا۔ اگر دنیا کی کسی قوم میں یہ دو جوہر اگر موجود ہیں چاہے وہ تعداد میں تھوڑی ہو، وہ دنیا پر چھا کے رہیں گے اور اگر یہ جوہر اس میں موجود نہیں ہیں تو یہ سمجھنا کہ یہ قوم بیمار ہے۔

فمن شرب منہ فلیس منی ومن لم یطعمہ فانہ منی الامن اغترف غرفۃ بیدہ.

ایک تو آزمائش ہوگی تمہارے صبر کی تم دھوپ میں چلو گے۔ پانی کی صاف شفاف نہر پہ پہنچو گے۔ اللہ کا حکم یہ ہے، پیاس پہ صبر کرو۔ پانی مت پیو یہ تمہاری آزمائش ہے۔ دوسری آزمائش یہ ہے کہ خدا کے حکم کا احترام تمہارے دل میں ہے یا نہیں۔

جنرل اکبر جو لیاقت علی مرحوم کے زمانے میں کمانڈر آف چیف ہوا کرتے تھے اکثر فوجوں میں مجھے بھی لے جاتے تھے وہ زمانہ بڑا اچھا خیر کا زمانہ تھا وہ فوجیوں سے کہا کرتے

تھے اگر تم نے شراب نہیں چھوڑی تو تم سپاہی ہو سکتے ہو، فوجی ہو سکتے ہو، مجاہد نہیں ہو سکتے۔ شراب پینے والا کبھی مجاہد نہیں ہو سکتا۔

حضرت طالوت نے اس قوم سے کہا کہ آج اس نہر کے اوپر تمہاری دو چیزوں کی آزمائش ہے ایک صبر دوسرے تقویٰ بس یہ ہیں کامیابی کے گر۔

اللہ تعالیٰ تمہارا یہ امتحان لینا چاہتے ہیں کہ تم تکلیفوں پر صبر کے عادی ہو یا نہیں۔ اور اگر نازک مزاجی ہے تو اللہ کا قانون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ زنانیوں کو کبھی انسانوں پر مسلط نہیں کرتا ہے۔

حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں جب جہاد کے لئے نکلے تو لکھنو کے ایک نواب صاحب تھے۔ انہوں نے کہا جی میں بھی جہاد کے لئے چلتا ہوں انہوں نے کہا! اچھا بھائی! آؤ ہمارے ساتھ چلو۔ وہ جانتے تھے کہ یہ لکھنو کے نواب صاحب بڑے نازکی مزاج ہیں۔ ساتھیوں سے کہہ دیا کہ یہ نواب صاحب جو ہیں میرے ہی ساتھ کھانا کھائیں گے تم نہیں کھلانا۔

مولانا ان کے ساتھ کھانا کھانے کے لئے بیٹھے تو مولانا نے زور سے ناک اپنی صاف کی نواب صاحب نے تو کبھی زندگی بھر یہ منظر نہیں دیکھا تھا لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھ کر کھڑے ہو گئے اور کہا میں یہ کھانا نہیں کھاؤں گا۔ مولانا اپنا سر جھکائے بیٹھے رہے۔ ساتھیوں سے کہا کہ دیکھو یہ نواب صاحب بھوکا ہے۔ انہیں کھانا نہیں کھلانا یہ میرے ہی ساتھ کھائے گا۔

دوسری مرتبہ آئے تو پھر کھانے پر بیٹھے تو مولانا نے زور سے اخ کے زور سے بلغم تھوک دیا۔ نواب صاحب پھر چنک کھڑے ہو گئے لاحول ولاقوۃ یہ کیا آپ کرتے ہیں۔ مجھ سے تو یہ کھایا نہیں جاتا۔ مولانا پھر اپنا کھانا کھانے لگے نواب صاحب دو وقت کے بھوکے، تیسرے وقت پھر آ کے بیٹھے تو مولانا نے پھر کھنکارا نواب صاحب نے کہا! اب اگر آپ پاخانہ بھی پھر دیں گے میں بغیر کھانا کھائے نہیں اٹھوں گا۔ میں دو وقت سے بھوکا ہوں۔

مولانا نے کہا نواب صاحب معاف کیجئے گا میرا مقصد آپ کو پریشان کرنا نہیں تھا مگر مجھے یہ بتانا تھا آپ جہاد کے لئے آئے ہیں پھولوں کی سیج پر لیٹنے نہیں آئے جو اللہ کی راہ میں نکلتا ہے اسے نزاکتیں چھوڑنی پڑتی ہیں آپ کی یہ نزاکتیں چل نہیں سکتی تھیں اس لئے میں

نے آپ کو پریشان کیا فرمایا کہ۔

ناز پروردہ تنعم نہ بردراہ بہ دوست عاشقی شیوہ رندان بلاکش باشد

جو مصیبتوں پر صبر کرنا نہیں جانتا اس کو یہ لفظ چھوڑ دینا چاہئے کہ میں عاشق ہوں عاشق کا لفظ استعمال کرنا توہین ہے عشق کی فارسی کا ایک بڑا اچھا شعر ہے فرمایا کہ عاشقی کی دکان جو ہے یہ چھوٹے چھوٹے پیسے سے نہیں لگتی اس کے لئے بڑے سرمائے کی ضرورت ہے۔

دکان عاشقی را بسیار مایہ باید دل ہائی ہم چو چشمہ چوں رود باری

جس کا دل بھٹی کی طرح سلگ رہا ہو۔ جس کی آنکھیں برسات کی نالیوں کی طرح بہہ رہی ہوں۔ وہ عشق کا دعویٰ کرسکتا ہے تو میں عرض کر رہا تھا کہ حضرت طالوت نے کہا کہ آج تم نہر پر آئے ہو ہمیں معلوم ہے تمہیں پیاس لگی ہے مگر ایک تو تمہیں یہ دکھانا ہے کہ ہم پانی پہ صبر کر کے دکھا سکتے ہیں۔ پھر دوسرے تمہیں یہ دکھانا ہے کہ خدا کا یہ حکم ہے۔ خدا کے حکم کا تمہیں احترام ہے یا نہیں اگر یہاں کامیاب ہوگئے تو یہ سمجھنا، ساری کامیابیاں تمہارے لئے ہیں۔

میرے دوستو! ہماری تاریخ ماضی کے اوراق ذرا الٹ کے دیکھ لیجئے ہندوستان کے اندر ہماری حکومت رہی یہ دور رنگیلے شاہ کا دور ہے۔ یہ وہ دور ہے کہ جس دور کے اندر رنگیلے شاہ چلے میں جاتے تھے جس طرح عورتیں چلے میں جاتی ہیں۔ اس طریقے سے ان کے ہاں بچہ ہوتا تھا، باقاعدہ یہ ڈرامہ ہوتا تھا گانا بجانے والے اور طبلہ سارنگی والے یہ ان کے اردگرد ہوتے تھے۔

کسی نے رنگیلے شاہ سے کہا کہ آپ کے ملک پر حملہ نہ ہو جائے تو وہ اپنے گانے بجانے والوں سے کہتے تھے کہ بھئی یہ سنا ہے کہ ہمارے ملک پر حملہ نہ ہو جائے۔ تو وہ کہتے تھے، یہ سب جھوٹ بولتے ہیں کہ جو یہ کہتے ہیں حملہ ہو جائے گا اور اگر حملہ ہوگیا تو یہ طبلے اور سارنگی کا میگزین کس دن کام آئے گا اس سے لڑتے لڑتے دشمنوں کو بھگا دیں گے۔

چنانچہ افغانستان سے نادر شاہ نے حملہ کیا دلی میں قتل عام ہو رہا ہے لوگوں نے رنگیلے شاہ سے کہا کہ اور تو کچھ نہیں ملک تو گیا قتل عام کو تو رکوایئے اس نے کہا کہ اچھا! نادر شاہ کے پاس سواری جا رہی ہے رنگیلے شاہ کی کیسے! سڑک صاف ہو رہی ہے پالکی سجائی جا رہی ہے دونوں

طرف سے چھڑکاؤ کر رہے ہیں خس کے پردے بنائے جارہے ہیں۔ نادر شاہ یہ سب کچھ دیکھ کے حیران ہے کہ یا اللہ! تیری بڑی شان ہے تو عورتوں کو بھی حکومت دیتا ہے...... وہ تشریف لا رہے ہیں یہ لکھا ہے کہ جب وہ نادر شاہ کے پاس پہنچے ہیں تو جا کر گلے ملے۔ نادر شاہ نے عمر بھر عطر کی خوشبو نہیں سونگھی تھی اور رنگیلے شاہ نے کبھی پسینہ کی بدبو نہیں سونگھی تھی وہ پسینے کی بدبو سے بڑے مدہوش ہو گئے جیسے کوئی بے ہوش ہو جاتا ہے۔ نادر شاہ یہ تماشا دیکھ رہا ہے......

انہوں نے کہا حضور آپ آئیے قلعہ میں چارج لے لیجئے نادر شاہ گئے بڑے بڑے امراء دربار کو بلایا بہترین بہترین قسم کی ڈشیں اور کھانے تیار کئے گئے۔ الوان نعمت موجود ہیں اور نادر شاہ حیران بیٹھا ہے وہ یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ اے اللہ تو ایسے عیش پرستوں کو بھی حکومت دیتا ہے۔ رنگیلے شاہ نے کہا کہ حضور! بسم اللہ کیجئے نادر شاہ نے اپنے ملازم کو آواز دی اور مضانی'' نان من بیار'' میری روٹی بھی لے کے آ، لوگ حیران کہ یا اللہ الوان نعمت دستر خوان پر رکھے ہوئے ہیں یہ نادر شاہ کیا یاقوتیاں کھاتا ہے کیا منگا رہا ہے ملازم آیا ایک تھیلے کے اندر سوکھی ہوئی روٹیوں کے ٹکڑے تھے اس نے سب کے سامنے نکالے اور نکال کر ایک جملہ کہا۔

میرے دوستو! اگر یہ روح مسلمان حاکموں کی ہوتی تو کبھی ہم سے اور آپ سے ہندوستان کا اقتدار نہ چھینا جاتا۔

پھر نادر شاہ نے کہا۔ اے لوگو! جو دستر خوان پر بیٹھے ہوئے ہو یہ غذا جو میں کھا رہا ہوں یہ فاتح قوم کی غذا ہے او جو غذا تم کھا رہے ہو یہ غلام قوم کی غذا ہے علامہ اقبال نے صحیح کہا ہے۔

میں تم کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے ۔ شمشیر و سنان اول طاؤس و رباب آخر

جب قوم بر سر اقتدار آتی ہے تو وہ جنگجو ہوتی ہے اس کے ہاتھ میں نیزے اور تلوار ہوتے ہیں، بندوق ہوتا ہے، اور جب قوم پر تنزل کا وقت آتا ہے تو ہر ایک کے بغلہ میں طبلہ اور سارنگی نظر آتا ہے۔

میرے دوستو! یہ قوم نہر پہ پہنچی ان کو منع کیا گیا تھا کہ پانی پر صبر کر کے دکھانا خدا کے حکم کا احترام کر کے دکھانا ایک صبر ایک تقویٰ۔ اب قرآن کریم کی زبان سے سنئے کہ ہوا کیا فرمایا کہ

فشربوا منه الا قليلاً منهم.

لوگوں نے خوب چھپ چھپ کے پانی پیا...... کیوں۔ مخلص نہیں تھے حضرت طالوت کی قیادت ہی پر اعتراض کر چکے تھے ان کی تربیت صحیح نہیں تھی۔ انہوں نے ظاہر کر کے دکھا دیا تھا نہ ہم صبر کر کے دکھا سکتے ہیں نہ خدا کے حکم کا احترام کر کے دکھا سکتے ہیں لیکن اللہ کے کچھ بندے ایسے تھے جنہوں نے کہا...... نہیں...... دم نکل جائے گا لیکن صبر کر کے دکھائیں گے ہم خدا کے حکم کا احترام کر کے دکھائیں گے۔ قرآن کریم کہتا ہے وہ تھوڑے تھے۔ **الا قليلا منهم۔**

اب یہ قوم آگے جا رہی ہے

فلما جاوزه هو والذين امنوا معه قالوا لا طاقة لنا اليوم بجالوت وجنوده.

میدان میں پہنچے، دشمنوں کو دیکھا لمبے لمبے قد دشمنوں کے دیکھ کے حضرت طالوت سے کہنے لگے۔ بابا ہم تو جہاد سے باز آئے ہمیں تو ہمارے گھر پہنچا دو **لا طاقة لنا اليوم الخ۔** جالوت اور جالوت کے لشکر سے لڑنے کی تاب ہمارے اندر نہیں۔ بھاگ گئے۔ جب یہ سب لوگ بھاگ رہے تھے وہی چند آدمی جنہوں نے نہر پہ پانی نہیں پیا تھا انہوں نے کہا خبردار ٹھہر جاؤ...... بھاگنے والوں کو بھاگنے دو...... یہاں ٹھہرو کیوں انہوں نے کہا بھاگنے والوں میں کوئی حکمت کی بات ہے تو ہم تم بھی بھاگ جائیں گے...... یہ کیوں بھاگ رہے ہیں۔ موت سے ڈر کے مارے بھاگ رہے ہیں تو کیا ملک الموت کو ان کی گلی کا ان کے شہر کا اور ان کے مکان کے نمبر کا پتہ معلوم نہیں ہے اگر کوئی آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اس میدان میں موت آئے گی اور گھر پر موت نہیں آئے گی تو کتنا بڑا بے وقوف ہے وہ...... اگر اس میں کچھ مصلحت ہے تو ہم بھی بھاگ جائیں گے۔

ایک بڑا حکیم تھا وہ کہیں کشتی میں بیٹھا اس نے ملاح سے پوچھا کہ میاں ملاح تم نے کچھ حکمت پڑھی ہے۔ اس نے کہا کہ حضور میں نے تو کوئی حکمت نہیں پڑھی۔ انہوں نے کہا ارے بے وقوف! تو نے تو آدھی عمر ہی ضائع کر دی۔ اس نے کہا کر دی ہوگی۔ آگے طغیانی آئی دریا کے اندر تو حکیم سے پوچھا کہ حکیم جی تیرنا آتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ تیرنا تو نہیں

آ تا انہوں نے کہا میں نے تو آدھی گنوائی تھی تو نے تو ساری گنوادی۔

یہ ہمارے تعلیم یافتہ حضرات کبھی کبھی علماء کو پریشان کرنے کے لئے کہا کرتے ہیں ایک سائنٹسٹ نے کہا مولانا ذرا یہ تو بتایئے کہ آسمان پر ستارے کتنے ہیں انہوں نے کہا ہمارے مولوی صاحب نے تو ہمیں یہ نہیں بتایا۔ انہوں نے کہا کہ آپ کیسے رہبر قوم ہیں۔ آپ کو یہ بھی نہیں معلوم۔ انہوں نے کہا بھئی نہیں معلوم۔

مولانا صاحب نے پوچھا اچھا مہربانی کر کے آپ یہ بتایئے کہ سمندر میں مچھلیاں کتنی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ بھئی یہ تو ہمیں بھی ہمارے پروفیسر نے نہیں بتایا انہوں نے کہ کہ ابھی تو فرش زمین کا علم آپ کا پورا نہیں ہوا تو عرش کی باتیں آپ کہاں سے کرتے ہیں۔

جب اس ملاح نے یہ کہا کہ جناب حکیم صاحب آپ نے تو پھر پوری زندگی ختم کر دی تو وہ پوچھنے لگے کہ اے ملاح میں تجھ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آج سے پہلے بھی کوئی حادثہ ایسا ہوا ہے اس نے کہا روز ہوتا ہے، میرا باپ مرا، میرا چچا مرا، میرا بھائی مرا۔ سب اسی طرح کے حادثوں میں مرتے ہیں کہنے لگے تو بڑا بے حیا ہے کہ تو نے ملاحی کا پیشہ نہیں چھوڑا......

اس نے حکیم سے پوچھا کہ آپ کے والد بزرگوار حیات ہیں انہوں نے کہا کہ نہیں۔ انتقال ہو گیا ہے۔ کہاں انتقال فرمایا۔ مکان کے اندر، چارپائی پر، بستر پر لیٹ کر مر گئے۔ آپ کے دادا وغیرہ وہ بھی اسی مکان کے اندر مرے اس ملاح نے کہا کہ آپ مجھ سے زیادہ بے حیا ہیں جو آپ نے اب تک وہ مکان ابھی تک نہیں چھوڑا۔

ملاح یہ بتانا چاہتا تھا کہ حضرت والا موت کا تعلق کشتی اور مکان سے نہیں ہے موت کا تعلق وقت سے ہے جب وقت آتا ہے تو اگر کشتی میں ہے تو وہاں موت آتی ہے اگر گھر میں ہو تو وہاں موت آتی ہے۔ میدان جہاد ہو تو وہاں موت آتی ہے تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اس قوم میں سے جو لوگ بھاگ رہے تھے، اوروں نے کہا خبردار ان کا ساتھ مت دو۔

قال الذين يظنون انهم ملقوا الله كم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله والله مع الصبرين.

یہ چھوٹی سی جماعت رہ گئی۔ جنہوں نے نہر پر صبر کر کے دکھایا، تقویٰ کر کے دکھایا جالوت

اور جالوت کے لشکر سے جب مقابلہ ہوا ہے تو مقابلے کے بعد اس چھوٹے سے لشکر نے جالوت کے لشکر کو تباہ و برباد کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو فتح عطا فرما دی۔ حالانکہ وہ مٹھی بھر آدمی تھے۔ لیکن کیوں! اس لئے کہ جس قوم کے اندر صبر موجود ہو جس قوم کے اندر تقویٰ موجود ہو وہ قوم اگرچہ تھوڑی ہو لیکن دنیا کے انسانوں پر غالب آ جاتی ہے۔

صبر اور تقویٰ کے کیا معنی؟ علامہ اقبال کا مشہور جملہ ہے، ہمارے علماء حضرات ناراض نہ ہوں، ہم بھی اسی میں ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ ہماری قوم کو دو طبقوں نے خراب کیا ایک متقی بزدل یعنی نماز روزہ تہجد میں بہت آگے آگے۔ اور پٹاخہ بھی چھوٹ جائے۔ تو دروازہ بند کر لیں۔ انہوں نے کہا کہ ایک متقی بزدل اور دوسرے بے دین بہادر، یعنی جان دینے کو تو تیار ہے، لیکن اگر کہا جائے کہ خدا کا حکم مان لو تو خدا کے حکم ماننے کو تیار نہیں۔ وہ بہادری جو بے دینی کے ساتھ ہو، وہ تقویٰ جو بزدلی کے ساتھ ہو۔ یہ قوم کو کبھی پنپنے نہیں دیتا۔

قوم جب پنپتی ہے جب اس میں تقویٰ بھی ہو اور بہادری بھی ہو، صبر کے معنی! معاف کیجئے! عام طور سے یہ سمجھے جاتے ہیں کوئی تمہیں مارے تو تم پٹتے رہو۔ کہو بھائی۔ کیا کریں۔ صبر کرو۔ مجبوری کا نام صبر۔

اسلام ایسے معنی کی کبھی آپ کو تلقین نہیں کرتا۔

صبر کے معنی یہ ہیں۔ اپنا ایک نصب العین مقرر کر لو۔ اور جب یہ نصب العین مقرر ہو جائے چاہے بھوک کی تکلیف ہو، چاہے جان کی تکلیف ہو چاہے مال کی تکلیف ہو، وہ ساری تکلیفیں ہنسی خوشی برداشت کرنا مگر اپنے نصب العین سے پیچھے قدم نہ ہٹانا۔

صبر کے معنی یہ ہیں اسی نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے بڑھتے چلے جاؤ تکلیفیں اٹھاتے جاؤ۔

معلوم ہوا یہ دو چیزیں ضمانتیں ہیں۔ یہ میں نے اپنی طرف سے نہیں کہا اب آپ قرآن کریم کی آیت سنئے فرمایا۔

وان تصبروا وتتقوا اگر تم صبر اختیار کرو اگر تم تقویٰ اختیار کرو **لا یضر کم کیدھم شیئاً** اللہ تعالیٰ تمہیں ضمانت دیتے ہیں۔ اے مسلم قوم، اگر صبر اور تقویٰ تم نے اختیار کر لیا ہم

تمہارے ذمہ دار ہیں تمہارا دشمن تمہارا بال بیکا نہیں کر سکے گا۔ دشمن کی چالیں تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکیں گی بشرطیکہ تم صبر کے خوگر رہو۔ صبر کے معنی یہ ہوئے ہم نزاکتیں چھوڑ دیں ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ آرام نہ اٹھائیں۔ آپ آرام اٹھائیں۔

حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے یہاں تو سبحان اللہ کیا طرز تھا نصیحت کا فرمایا کہ آپ انگلیوں پر شمار کرلیں۔ ایک ہے آسائش دوسرے ہے زیبائش تیسرے ہے آرائش چوتھی ہے نمائش ان میں دو کی اجازت ہے دو کی اجازت نہیں فرمایا کہ صرف دکھانے کے لئے دکھاوا اختیار کرنا، نمائش اختیار کرنا اس کے لئے مسلمان کو اجازت نہیں۔ آرائش کے معنی بھی یہی ہے کہ بناوٹی قسم کی خوبصورتی سی پیدا کریں اس کی بھی اجازت نہیں۔ ہاں دو چیزوں کی اجازت ہے آسائش جو آپ کے آرام اور راحت سے متعلق ہے زیبائش جس سے نظافت اور پاکیزگی پیدا ہوتی ہے۔ آپ کے کپڑے صاف ہوں، آپ کا مکان صاف ہو آپ کی ہر چیز صاف ستھری رہے۔

فرمایا آسائش اور زیبائش کی اجازت ہے، آرائش اور نمائش کی اجازت نہیں ہے۔

تو ہم کو اور آپ کو صبر کی زندگی اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے، نزاکت اختیار نہ کریں۔

اور جب ہم یہ دو چیزیں اپنے اندر پیدا کرلیں گے، ایک جوہر صبر اور ایک جوہر تقویٰ۔ تو ان شاء اللہ مسلم قوم اسی قابل ہو جائے گی جو اپنی عظمت رفتہ کو واپس لے آئے گی آخر میں، میں ایک قطعہ پڑھ کے ختم کر دیتا ہوں۔ فرمایا۔

رستم خفتہ ہے تو کس بل نہیں ہے کم ترا — جاگنے کی دیر ہے پھر ہے وہی دم خم ترا
یہ اگر ہو جائے زائل نیند کا عالم ترا — چار سو عالم میں لہرانے لگے پرچم ترا

اگر مسلم قوم یہ جوہر اور خصوصیت اپنے اندر پیدا کرلے، مسلمانوں کی عظمت رفتہ واپس آسکتی ہے۔

قرآن کریم کا یہ واقعہ ہم مسلمانوں کو یہ درس اور یہ سبق دیتا ہے۔ اور اسی میں کامیابی کا راز ہے۔ اس میں ملتوں کے اور قوموں کے عروج کا راز ہے۔

اب میں معذرت چاہوں گا۔ دعاء کیجئے ہم کو اور سب کو اللہ تعالیٰ صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

مشتاق احمد عفی عنہ (مترجم)
صوبائی اسمبلی صوبہ سرحد۔ پشاور

روزہ اور تقویٰ

اَلحَمدُ لِلّٰہِ نَحمَدُہٗ وَنَستَعِینُہٗ وَنَستَغفِرُہٗ وَنُؤمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیہِ وَنَعُوذُ بِاللّٰہِ مِن شُرُورِ اَنفُسِنَا وَمِن سَیِّاٰتِ اَعمَالِنَا مَن یَّھدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضلِلہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشھَدُ اَن لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحدَہٗ لَا شَرِیکَ لَہٗ وَنَشھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَولَانَا مُحَمَّدًا عَبدُہٗ وَرَسُولُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیرِ خَلقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصحٰبِہٖ اَجمَعِینَ۔

اَمَّا بَعدُ! فَاَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ۔

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ۔

خطاب ۳

روزہ اور تقویٰ

اللہ تعالیٰ نے روزوں کی فرضیت کے حکم کی حکمت یہ بتائی کہ **لعلکم تتقون** (تا کہ تم متقی بن جاؤ) اس سے معلوم ہوا کہ روزوں کی عبادت کی خصوصیت اور اس کا ذاتی اثر یہ ہے کہ انسان میں تقویٰ جیسی پسندیدہ صفت پیدا ہو جاتی ہے۔

دراصل تقویٰ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جو اللہ کے جلال و جبروت کو پیش نظر رکھتے ہوئے دل میں اس کی نافرمانی کا خیال تک نہ آئے، اور نہایت خوش دلی اور کمال آمادگی کے ساتھ ہر حالت میں اللہ کی رضا کو مقدم رکھے عام طور پر اردو زبان میں اس کا مفہوم خدا کا خوف اور پرہیزگاری کے الفاظ سے ادا کیا جاتا ہے۔

مزید وضاحت کے لئے یہ واقعہ بھی پیش نظر رکھئے تو تقویٰ کی حقیقت نکھر کر آپ کے سامنے آ جائے گی حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ممتاز صحابی اور عہد نبوت کے مشہور مفسر قرآن ہیں۔ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دن ان سے تقویٰ کی حقیقت دریافت کی اس پر حضرت ابی ابن کعب نے حضرت عمر سے پوچھا کہ کیا کبھی آپ کو کسی خاردار راستہ پر چلنے کا اتفاق ہوا ہے؟ حضرت عمر نے فرمایا جی ہاں بارہا ایسے راستوں پر چلنے کا اتفاق ہوا ہے حضرت ابی ابن کعب نے کہا تو آپ نے اس وقت کیا کیا؟

حضرت عمر نے جواب دیا کہ میں نے اپنے جسم اور کپڑوں کو سنبھالا اور پوری کوشش کی کہ اپنے جسم اور کپڑوں کو کانٹوں سے بچا کر صحیح و سالم نکل جاؤں اس پر حضرت ابی ابن کعب نے فرمایا **فذالک التقویٰ** بس یہی تقویٰ ہے حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ کا مقصد اور اس کے مفہوم و مراد کی تشریح اس سے بہتر طریقہ پر نہیں کی جا سکتی۔

قرآن حکیم میں توحید، رسالت اور آخرت پر ایمان کے بعد مسلمانوں سے بار بار جس نیکی کا مطالبہ کیا ہے اور ان کی فلاح و بہبود کو جس پر منحصر رکھا ہے وہ یہی تقویٰ ہے۔

بلاشبہ اسلام ایک آفاقی مذہب ہے اور ساری دنیا کو ایک عالمگیر برادری میں شامل کرنا اس کا عین منشا ہے وہ قومیت وطنیت اور نسل پرستی کے فخر وغرور اور انسانوں کے اپنے تجویز کئے ہوئے امتیازات کو مٹا کر اللہ کے پسندیدہ امتیاز یعنی تقویٰ کو معیار انسانیت قرار دیتا ہے چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرام کے سامنے اپنے خطبہ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا کہ۔

اے لوگو تمہارا رب ایک ہی ہے اور تم سب کا باپ بھی ایک ہی ہے تو سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے بے شک بزرگ تو اللہ کے نزدیک تم میں سے وہ ہے جو تم سب سے زیادہ پرہیزگار ہے کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں ہے مگر تقویٰ اور پرہیزگاری سے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت بلیغ اور موثر انداز میں اس کی وضاحت فرمادی کہ اللہ کے نزدیک کوئی امتیاز، کوئی نسبت اور کوئی تعلق معتبر نہیں حتیٰ کہ پیمبر زادگی قابل لحاظ نہیں اس بارگاہ میں صرف تقویٰ ہی مطلوب ہے چنانچہ صحابہ کرام، اہل بیت عظام اور ائمہ دین کے تقویٰ میں کلام نہیں ان سب کا تقویٰ دنیا بھر کے مسلمانوں کے نزدیک قابل احترام ہے ہی لیکن اس کے علاوہ جب بسطام کے بایزید جنید بغدادی وشبلی، غوث اعظم لاہور کے داتا سرہند کے مجدد، سندھ کے شاہ عبداللطیف، اجمیر کے خواجہ کلیر کے صابر، دہلی کے نظام الدین اور دوسرے علاقوں کے اولیاء، صلحاء اور بزرگان دین رحمھم اللہ کا ذکر آتا ہے ادب واحترام سے ہمارے سر جھک جاتے ہیں ہم یہ نہیں دیکھتے کہ یہ بزرگ کس سرزمین کے رہنے والے اور کس قبیلہ و خاندان سے تعلق رکھنے والے تھے بلکہ ہمیں ان کی شخصیت اور ان کے حیرت ناک کارناموں میں تقویٰ کی عملداری نظر آتی ہے اور اسی صفت کی وجہ سے ان کی زندگی قابل تقلید بن گئی گویا ان کی متقیانہ زندگی کو اسلام کے آفاقی نظریہ حیات کی اشاعت میں بڑا دخل رہا ہے۔

قرآن حکیم میں بار بار تقویٰ اختیار کرنے اور اپنی زندگی میں آخر وقت تک اس صفت پر قائم رہنے کی تاکید کی گئی ہے ارشاد فرمایا گیا۔ **یا ایھا الذین امنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ ولا تموتن الا وانتم مسلمون** (آل عمران، ع،۱۱) یعنی اے ایمان والو اللہ سے ڈرو

جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے یہاں تک کہ تم کو اسی فرمانبرداری کی حالت میں موت آئے مطلب یہ ہے کہ زندگی کا کوئی حصہ تقویٰ سے خالی نہ ہو اور زندگی کی آخری سانس تک ہمہ وقت اللہ کی فرمانبرداری میں مصروف رہنا چاہیے اسی مفہوم کو ایک دوسری جگہ یوں ظاہر فرمایا اتقوا اللہ مااستطعتم واسمعوا واطیعوا۔ (تغابن۔ ع۔۲) یعنی اللہ سے ڈرو اور تقویٰ اختیار کرو جس قدر بھی تم سے ہو سکے اور اللہ کے احکام کو بگوش دل سنو اور اطاعت کرو یہاں بھی بندوں سے ان کی استطاعت کے مطابق تقویٰ کا مطالبہ کیا جا رہا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ بہر حال اللہ کے احکام کی فرمانبرداری کی جائے۔

قرآن کریم میں انسانوں کو بار بار جس نیکی کی طرف متوجہ کیا گیا ہے وہ ایمان اور عمل صالح ہے لیکن اللہ نے نیکی کی حقیقت اور بنیاد تقویٰ ہی کو قرار دیا ہے ایک آیت میں اسی کی وضاحت کی گئی ولکن البر من اتقی۔ (بقرہ۔ ع۔۱۴) یعنی لیکن نیکی کی حقیقت یہی ہے کہ اللہ سے ڈرے اور تقویٰ اختیار کرے گویا نیکیوں کا اصل محرک تقوی ہے اور اللہ کے نزدیک وہی نیکیاں قابل اعتبار ہیں جن کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہو۔

ان جیسی آیات کے علاوہ قرآن میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن میں متقیوں کی صفات اور ان کی صلاحیتوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کی تعریف کی گئی ہے اللہ نے ان کو اپنا دوست کہا ہے ان کے لئے بڑے اجر و ثواب کا وعدہ کیا ہے جنت میں ان کے لئے نعمتوں کی تفصیل بیان کی ہے اسی طرح تقویٰ کے خلاف روش اختیار کرنے والوں پر اللہ نے اپنے غیظ و غضب کا اظہار فرمایا ہے ان کو آخرت کی باز پرس سے ڈرایا ہے۔ غرض قرآن نے نہایت حکیمانہ انداز سے مسلمانوں کو تقویٰ اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے۔

تقویٰ کی اس ضروری وضاحت کے بعد آیئے اب اس حقیقت پر غور کریں کہ ماہ رمضان میں روزوں کی عبادت کس طرح ایک مسلمان کو تقویٰ شعار بناتی ہے اس بات کو سمجھنے کے لئے بھی ہمیں قرآن ہی سے مدد لینی پڑے گی۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں مسلمانوں کو قربانی کا حکم دیا اور اس کے بعد ہی ارشاد فرمایا کہ۔

لن ينال الله لحومها ولا دماؤها ولكن يناله التقوى منكم (الحج . ع، ۵)

یعنی تمہاری قربانیوں کا گوشت اور خون اللہ کو نہیں پہنچتا لیکن اس کے پاس جو کچھ پہنچتا ہے وہ تمہارے دلوں کا تقویٰ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو ہماری قربانیوں کے گوشت پوست اور خون کی ضرورت نہیں وہ محض تعمیل حکم کے مخلصانہ جذبہ کو دیکھتا ہے اور اسی جذبہ کا نام تقویٰ ہے بالکل اسی طرح ماہ رمضان کے متعینہ اوقات میں اپنے بندوں کو بھوکا پیاسا دیکھنے میں اللہ تعالیٰ کو کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ بلکہ یہاں بھی تعمیل حکم کے اسی جذبہ کو ابھارا جارہا ہے جس کا نام تقویٰ ہے۔

روزہ کی عبادت سے تقویٰ کی خصوصیت کا اندازہ اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ روزہ نسبتاً ایک خاموش عبادت ہے جس میں ریاکاری اور نمود و نمائش کے امکانات بہت کم ہیں یعنی مسلمان روزہ نہ رکھے اور چھپ چھپا کر کھا پی لیا کرے تو دوسروں کو اس کا پتہ نہیں چل سکتا لیکن وہ محض اللہ کے حکم کی تعمیل اور اس کی رضا طلبی کی خاطر اس کو حاضر و ناظر سمجھ کر روزہ رکھتا ہے اور اگر کبھی سحری میں آنکھ بھی نہ کھلے تو بغیر سحری کے اس فرض کو پورا کرتا ہے اسی لئے حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہوا کہ **الصوم لی وانا اجزی به**۔ یعنی روزہ میرے لئے ہے میں ہی اس کی جزاء ہوں اس طرح روزہ کی فرضیت کے ساتھ **لعلکم تتقون** کے ارشاد سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اس عبادت کو تقویٰ سے خاص مناسبت ہے اب کچھ لیلۃ القدر کے بارے میں عرض ہے۔

اخفاء اور ابہام کی سب سے بڑی حکمت یہ ہے کہ ایک شب کی خاطر پورا عشرہ شب بیداری عبادت اور بندگی میں گذرتا ہے۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ لیلۃ القدر ہر سال بدلتی رہتی ہے اور آخری عشرہ کی مختلف طاق راتوں میں دائر رہتی ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ''لیلۃ القدر'' کے لفظ میں نو حرف ہیں اور یہ لفظ سورہ قدر میں تین مرتبہ استعمال کیا گیا ہے۔

وما ادرٰک ما لیلة القدر لیلة القدر خیر من الف شهر.

پس مذکورہ بالا تین الفاظ کو ان کے حروف کی تعداد کے مطابق اگر نو میں ضرب دیا جائے تو ستائیس کا عدد نکلتا ہے لہٰذا لیلۃ القدر رمضان کی ستائیسویں شب ہے اور یہی قول مشہور بھی ہے اور اکابرین سلف کا تعامل بھی اسی پر ہے۔

جس رات کی عظمت وتقدیس کی یہ شان ہے اور جس میں ایک لمحہ کی عبادت بھی بندہ کو اللہ سے قریب کردیتی ہے اس بارہ میں غور کرنا پڑے گا اس میں کونسی عبادت اور کونسا عمل خیر اختیار کرنا چاہئے؟

کیونکہ صرف جاگنا یا جاگ کر لایعنی اور بے ہودہ مشاغل میں لگ جانا اس رات کی سب سے بڑی ناقدری اور اپنی محرومی ہے اس رات کی عبادت اور بندگی کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا کہ اگر مجھے یہ رات مل جائے تو میں کونسی عبادت اور کونسا عمل اختیار کروں اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

قولی اللهم انک عفو تحب العفو فاعف عني.

اے اللہ تو بیشک خطاؤں سے درگذر کرنے والا ہے اور معاف کر کے تو بہت خوش ہوتا ہے پس میرے گناہوں کو بھی معاف کردے اس سے معلوم ہوا کہ اس شب میں کوئی مخصوص اور معین قسم کی عبادت نہیں ہے بلکہ ہر قسم کی عبادت اختیار کی جاسکتی ہے خواہ وہ نوافل کی قسم سے ہو یا تلاوت قرآن، یاد الٰہی میں مصروف ہو یا انسانوں کی ہمدردی غم خواری میں البتہ حضرت عائشہؓ صدیقہ کے سوال کے جواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو الفاظ ارشاد فرمائے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ توبہ واستغفار اور دعا اس رات کی خاص عبادتیں ہیں کیونکہ ارشاد نبوی سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ حق تعالیٰ آسمان دنیا پر نزول فرماتے ہیں اور بندوں کو پکار پکار کر مانگنے اور دعا کرنے کی ترغیب دیتے ہیں تاکہ حق تعالیٰ ایک طرف خطاؤں کو بخش دیں اور دوسری طرف دعاؤں کو قبول فرمالیں ویسے بھی آقا سے قریب ہونے کا موقع دعا کے لئے سب سے مبارک موقع ہے کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ میرے بارے میں پوچھتے ہیں کہ آیا وہ قریب ہے یا دور؟ تو آپ ان کو بتلا دیجئے کہ میں صرف قریب ہی نہیں ہوں بلکہ میں تمہاری شہ رگ سے بھی قریب ہوں۔

خطبہ عید الفطر تکمیل صیام کا شکر اور اظہار بندگی ہے

انسان کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ کسی نہ کسی شکل میں ایسے ایام کی یاد تازہ رکھنا چاہتا ہے جن کو قومی اور ملی اعتبار سے کوئی خصوصیت اور اہمیت حاصل ہو۔ چنانچہ اقوام عالم کی تاریخ پر اگر نظر ڈالی جائے تو ہر قوم اور ہر ملت کی تاریخ میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ ان قوموں

کی تاریخ میں بھی جو کسی دین سماوی پر یقین رکھتی ہیں اور کسی نبی اور رسول کی ہدایات و تعلیمات سے اپنے آپ کو وابستہ سمجھتی ہیں اور ان اقوام میں بھی جو کسی صحیح معقول دین و مذہب اور شریعت سے نا آشنا ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کواکب پرست، بت پرست، اور مشرک تھی۔ اس قوم میں کچھ دن ایسے مقرر تھے جن میں وہ لوگ اپنی بستیوں سے باہر جا کر اجتماعی طور پر خوشیاں مناتے اور میلے لگاتے تھے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے توحید کی تبلیغ فرمائی طرح طرح سے ان کو بت پرست کی نامعقولیت اور خدا پرستی کی معقولیت سمجھائی لیکن شرک و بت پرستی کی خوگر قوم نے جو خود ساختہ بتوں کو ہی کارساز سمجھتی تھی اس نے توحید پر یقین کرنے سے انکار کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عملی اور مشاہداتی طور پر بتوں کی بے کسی و بے بسی قوم کے ذہن نشین کرانے کی دل میں ٹھانی اور دل ہی دل میں عہد کیا کہ۔

ترجمہ:۔ خدا کی قسم میں تمہارے بتوں کے ساتھ ضرور ضرور ایک تدبیر کروں گا اس کے بعد کہ تم لوگ پیٹھ پھیر کر چلے جاؤ گے۔

مسرتوں کا اظہار

چنانچہ اپنی عید کے مقرر دن میں جب وہ سب لوگ حسب عادت بستی سے باہر خوشیاں منانے گئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے بت خانہ میں جا کر سارے بتوں کو توڑ پھوڑ کر ٹھکانہ لگا دیا اور ان میں سے سب سے بڑے بت کے کندھوں پر کدال لٹکا دیا قوم نے واپس آ کر بتوں کا یہ حال دیکھا تو حضرت ابراہیم نے انتہائی حکیمانہ انداز سے بتوں کی بے بسی ان پر واضح کر دی غرض قوم ابراہیم کا وہ عید کا ہی دن تھا جس روز یہ واقعہ پیش آیا اور اس طرح وہی دن جو اس مشرک اور بت پرست قوم کے لئے کسی اعتبار سے اہمیت کا حامل اور مشرکانہ طور پر عید کی خوشیاں اور رنگ رلیاں منانے کا دن تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیات طیبہ میں تبلیغ توحید کا ایک اہم دن قرار پایا۔

بنی اسرائیل اپنی بداعمالیوں کی سزا میں قوم فرعون کے غلام بن کر ذلت و پستی کی زندگی گزار رہے تھے یہودی ایک مقرر دن میں بستیوں سے باہر کسی میدان میں جمع ہو کر عید منایا

کرتے تھے اور فرعون کی قوم قبطیوں کی طرف سے ان کو اس کی اجازت تھی۔ حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر ایک مرتبہ پھر رحم فرمایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ اس قوم کو بدترین قسم کی غلامی سے نجات عطا فرمائی۔ یہودیوں نے اس یوم نجات کو بھی قومی اور اجتماعی طور پر خوشیاں منانے اور مسرتوں کے اظہار کے لئے مقرر کرلیا اور ہر سال اس تاریخ کو وہ عید منانے لگے عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یوم ولادت کو یوم عید قرار دیا اور تقریباً دو ہزار سال سے وہ اس دن میں اپنی مسرتوں اور خوشیوں کا اظہار کرتے ہیں مجوسی اپنے پیشوا زرتشت کے یوم ولادت میں اظہار مسرت کے لئے کھیل تماشے کرتے تھے اسی طرح ایرانی قوم میں نوروز اور مہر جان وغیرہ بعض ایام، ایام عید تھے برصغیر کی بسنے والی مشرک اور ہندو قوم کے یہاں بھی ہولی اور دیوالی سال کے دو دن خصوصیت سے تہوار اور عید کی حیثیت رکھتے ہیں اہل مکہ یوں تو پہلے سے بھی سال بھر کے متعدد ایام میں خوشیاں مناتے میلے لگاتے، شراب خوری اور رقص و سرور کی محفلیں منعقد کرتے تھے مگر بعثت اور اسلام کی آمد سے چالیس سال قبل یمن کے عیسائی حکمران ابرہہ نے خانہ کعبہ کو منہدم کرنے کے لئے لشکر کشی کی اور عبرتناک طور پر ناکام و نامراد ہو کر تباہ و برباد ہوا۔ اہل مکہ نے اپنے اور بیت اللہ کے محفوظ رہنے کے اس دن کو خاص اہمیت دی اور اسی خوشی کی یادگار کے طور پر اس دن سے سن کا آغاز کیا اور آئندہ پیش آنے والے واقعات کی مدت اور تاریخ کا تعین اسی عام الفیل سے کیا جانے لگا۔

جذبات کے پیش نظر

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ میں تشریف لائے تو یہاں کے لوگوں میں سال کے دو دن ایسے مقرر تھے کہ ان میں یہ لوگ خوشیاں مناتے اور کھیلتے کودتے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کا یہ طریقہ دیکھا تو دریافت فرمایا کہ یہ دو دن کیسے ہیں۔

انصار صحابہ نے عرض کیا کہ زمانہ جاہلیت میں ہم ان دو دنوں میں کھیلا کودا کرتے تھے۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حق تعالیٰ نے تمہیں ان دو دنوں کے بدلہ میں ان

سے بہتر دو دن عطا فرمائے ہیں یوم اضحیٰ اور یوم فطر غرضیکہ ہزار ہا سال کی تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر ملت میں پورے سال کے ایام میں سے ایسے کچھ دن ضرور مقرر رہے ہیں جن کو کسی نہ کسی طرح کی اہمیت اور خصوصیت حاصل تھی اور جن میں اجتماعی طور پر خوشیوں اور مسرتوں کا مظاہرہ کیا جاتا رہا ہے اور ان ایام میں پیش آنے والے واقعات کی یاد اس طرح تازہ رکھی گئی ہے۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخ اقوام کے اسی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا" **یا ابا بکر ان لکل قوم عید اوھذا عیدنا**"

اے ابوبکرؓ بلاشبہ ہر قوم کے لئے عید ہوتی ہے اور یہ ہماری عید ہے۔ گویا مذہب اسلام نے آ کر انسان کے اس فطری جذبہ کو پامال نہیں کیا بلکہ نہایت لطیف انداز میں ان فطری جذبات کا رخ ایسی سمت کو موڑ دیا جس سے اس کے خوشی منانے اور مسرت کے اظہار کی خواہش کی تکمیل بھی ہو جائے ساتھ ہی ساتھ مسرتوں کے اظہار میں غیر مفید اور غیر سنجیدہ افعال وحرکات کے ارتکاب کی بجائے اس کو تخلیق انسانی کے مقصد کا شعور اور اس کی بیداری بھی نصیب ہو اور اس کے تحت الشعور جذبات کے پیش نظر ان مسرتوں کی وابستگی بھی حق تعالیٰ کی عظیم نعمتوں سے رہے جن کی یاد ہر سال اس کے قلب وذہن میں تازہ ہوتی رہے۔

اللہ کی حمد وثنا

دین اسلام کی دو عیدوں اور دو تہواروں میں سے ایک کا لقب عید الفطر ہے اور دوسری کا نام عید الاضحیٰ۔ عید الاضحیٰ حق تعالیٰ کے حضور ایک عظیم انسان کی عظیم قربانی پیش کرنے کی یادگار اور عید الفطر ایک طرف انسان پر حق تعالیٰ کے عظیم ترین انعام نزول قرآن کی سالگرہ اور یادگار ہے اور دوسری طرف مسلسل ایک ماہ تک ایک دشوار اور پر مشقت عبادت ادا کرنے کی توفیق پر قلبی مسرتوں کا اظہار اور شکر گزاری ہے گویا عید الاضحیٰ میں انبیاء سابقین میں سے ابوالانبیاء اور حق تعالیٰ کے ایک جلیل القدر اولوالعزم پیغمبر سے اپنی وابستگی اور ان پر ایمان کا اعلان ہے اور اس وابستگی پر خوشیوں کا مظاہرہ ہے جو اسلام کی تعلیم کردہ عبادات اور تکبیرات کا مظاہرہ ہے جو اسلام کی تعلیم کردہ عبادات اور تکبیرات کی شکل میں کیا جاتا ہے اور عید الفطر میں حق تعالیٰ کے اس

خصوصی انعام کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے جو ابتدائے آفرینش سے لے کر دنیا کی تمام قوموں اور امتوں میں سے صرف امت محمدیہ علی صاحبہا السلام پر کیا گیا ہے اور رمضان المبارک کی طویل المدت عبادت صوم اور قیام لیل کے ادا کرنے کی توفیق پر منت پذیری اور جذبات تشکر کا اظہار ہے اور یہ دونوں وہ خصوصی نعمتیں ہیں جن کا تعلق خود مذہب اسلام اور دین محمدی سے ہے۔
چنانچہ سال بھر کے شب و روز میں جہاں اور چند راتوں اور دنوں کو شعائر اسلام ہونے کی حیثیت حاصل ہے ان کے ساتھ ہی ساتھ عیدالاضحیٰ اور عیدالفطر کے دن اور ان دونوں دنوں کی راتیں ان شعائر اسلام سے ہیں جن کے اوقات اور ساعتوں کو حق تعالیٰ کی نظر میں عظمت اور مقبولیت حاصل ہے اور جیسا کہ مذہب اسلام کا ایک مخصوص انداز ہے کہ اس قسم کے خاص اوقات اور بابرکت شب و روز میں وہ عبادت کے ذریعہ حق تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی تلقین کیا کرتا ہے اسی طرح اس نے عیدالاضحیٰ اور عیدالفطر کے دنوں اور ان کی راتوں کی برکتیں بتا کر ان میں عبادت کی ترغیب دی ہے چنانچہ ایک حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ترجمہ:۔ جو شخص عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کی راتوں میں عبادت کرے گا اس کا قلب ان دن مرے گا نہیں جس دن سارے قلوب مرجائیں گے۔

ایک اور حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سال بھر کی پانچ راتوں کی اہمیت اور خصوصیت اس طرح بیان فرمائی ہے۔

ترجمہ:۔ ذی الحجہ کی آٹھویں تاریخ کی رات عرفہ یعنی نویں تاریخ کی رات یوم نحر یعنی عیدالاضحیٰ کی رات عیدالفطر کی رات اور نصف شعبان کی رات یعنی شب برات۔

عیدالفطر اور عیدالضحیٰ دونوں عیدوں کے دنوں میں مستقل طور پر دو دو رکعتیں ادا کرنا واجب قرار دیا گیا اور ان دوسری نمازوں سے زائد کچھ تکبیریں مقرر کی گئیں اور خاج از نماز بھی اللہ کی وحدانیت اس کی حمد و ثناء اور کبریائی بیان کرنے کی خاص طریقے سے ترغیب دی گئی ہے۔

انعام کی رات

حافظ عبدالعظیم منذری رحمۃ اللہ نے اپنی مشہور تصنیف ''الترغیب والترہیب'' میں ماہ

رمضان المبارک کے شب وروز شب عیداور روز عید سے متعلق ابن حبان اور بیہقی کے حوالہ سے ایک طویل حدیث حضرت ابن عباس سے نقل کی ہے جس کے آخری حصہ کا مفہوم یہ ہے کہ۔

"جب عید الفطر کی رات آتی ہے تو اس کا نام لیلۃ الجائزہ (انعام کی رات) رکھا جاتا ہے پھر جب عید کی صبح ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ تمام شہروں میں فرشتوں کو بھیجتے ہیں فرشتے زمین پر اتر کر راستوں کے سروں پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور امت محمدیہ کو پکار پکار کر بلاتے ہیں ان کی آواز انسانوں اور جنوں کے علاوہ ہر مخلوق سنتی ہے فرشتے کہتے ہیں اے امت محمد! رب کریم کی جانب نکلو وہ تم کو بڑا اجر دے گا اور بڑے قصور معاف فرمائے گا جب لوگ عیدگاہ میں آجاتے ہیں تو حق تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ ایک اجیر جب اپنا کام کر چکے تو اس کا بدلہ کیا ہے فرشتے عرض کرتے ہیں اے ہمارے مالک ومعبود! اس کا بدلہ یہ ہے کہ اس کو پورا پورا اجر آپ اس کو عطا فرمادیں حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے میرے فرشتو! میں تم کو گواہ بناتا ہوں میں نے ماہ رمضان میں ان کے صیام وقیام کا اجر وثواب اپنی رضا ومغفرت کو قرار دیدیا...... اور جب لوگ نماز عید سے فارغ ہو کر واپس ہوتے ہیں تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اب واپس چلے جاؤ تمہاری بخشش کر دی گئی تم نے مجھ کو راضی کیا میں تم سے خوش ہو گیا۔ فرشتے اس وقت بہت خوش ہوتے ہیں جب ماہ رمضان سے افطار کے وقت یعنی عید کے دن اس امت کو حق تعالیٰ اجر عطا فرماتے ہیں۔"

شریعت اسلامیہ نے فرزندان توحید کے لئے عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی مسرتوں اور شادمانیوں کے اظہار کا پسندیدہ طریقہ یہ قرار دیا ہے کہ عید کے روز مسواک وضو اور غسل کر کے صاف ستھرا اور اچھا لباس جو میسر ہو وہ پہنا جائے ممکن ہو تو خوشبو لگائیں تاکہ اس طرح حق تعالیٰ کے انعامات کا اظہار اور شکر یہ بھی ادا ہو اور ایک سے دوسرے کو کوئی تکلیف نہ ہو اسی طرح شان وشوکت کے مظاہرہ کے لئے سنت یہ ہے کہ دوگانہ عید ادا کرنے کو ایک راستہ سے جائیں اور دوسرے راستہ سے واپس ہوں۔

عید الاضحیٰ اور عشق الٰہی

اس مقدس سلسلہ رسالت ونبوت کے سب سے پہلے فرد وجود جسمانی کے اعتبار سے

حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں اور سب سے آخری فرد اکمل حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ درمیانی افراد میں سے ایک اہم ترین شخصیت حضرت ابراہیم خلیل اللہ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہے آپ سے پہلے نبوت ورسالت افرادی طور پر عطا کی جاتی تھی لیکن حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ فضل وشرف خاندانی طرز پر عطاء فرمایا گیا چنانچہ نبوت و رسالت پھر آپ ہی کے خاندان اور آپ ہی کی ذریت میں رہی اور گویا حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نبوت مابعد کے سنگم اور مجمع البحرین میں آپ کے صاحبزادگان میں اگر ایک بیٹے حضرت اسحٰق علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ان کی اولاد اور نسل میں انبیاء ورسل کی کثرت تعداد کا شرف حاصل ہوا تو دوسرے صاحبزادے یعنی آپ کے جلیل القدر فرزند اکبر حضرت اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ فضل عطا کیا گیا کہ ان کی اولاد میں خاتم الانبیاء والرسل کو پیدا کیا گیا جو تمام انبیاء سابقین اور جملہ رسولوں کے کمالات علمی وعملی کے جامع تھے۔

عیدالاضحیٰ پر قربانی کی رسم عبادت کا تعلق حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت اسماعیل ذبیح اللہ کے ایک نادرہ روزگار واقعہ سے ہے یوں تو سلسلہ عبادت میں جانی اور مالی قربانی دینے کی رسم عبادت دورآدم علیہ السلام ہی سے چلی آئی ہے اور آغاز نبوت سے ہی انسان کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ حق تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے اس کے بتائے ہوئے طریقوں سے مال کی قربانی بھی دیا کرے اور جب جان کی قربانی کا موقع پیش آئے تو جان جیسی عزیز شئی بھی قربان کردے۔ چنانچہ قرآن کریم میں حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دو بیٹوں کی قربانی کا ذکر سورہ مائدہ میں کیا گیا ہے کہ ان کے دو بیٹوں نے مالی قربانی پیش کی ان میں سے ایک کی قربانی قبول ہوگئی اور جس کا جذبہ خراب تھا اس کی قبول نہ ہوئی یہ ابن آدم قابیل تھا جس کی قربانی قبول نہ ہوئی تھی اس نے حسد اور جلن میں آ کر اپنے بھائی ہابیل کو قتل کرڈالا جس کی قربانی کو نیک نیتی اور خلوص کی وجہ سے شرف قبولیت حاصل ہوگیا تھا ہابیل نے حکم خداوندی پر ثابت قدم رہ کر جان دے دی اور اپنے بھائی پر حق تعالیٰ کے خوف وخشیت کی وجہ سے دست درازی نہ کی اور کہہ دیا کہ۔

''اگر تو مجھے قتل کرنے کے لئے میری طرف دست درازی کرے گا تو میں تجھے قتل کرنے کے لئے تیری طرف دست درازی کرنے والا نہیں اللہ سے ڈرتا ہوں جو سارے جہانوں کا رب ہے۔(سورہ مائدہ)

یہ روئے زمین پر سب سے پہلا قتل تھا اور اطاعت خداوندی میں جان کی بھی سب سے پہلی قربانی تھی گویا نسل انسان میں سب سے پہلے شہید ہابیل ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بھی اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے جان کی قربانی تھی مگر حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیرانہ سالی میں عطا شدہ اکلوتے بیٹے کو جس طرح ایمائے خداوندی پر قربانی کے گھاٹ چڑھادیا اس میں اور ہابیل کی جانی قربانی میں زمین و آسمان کا فرق ہے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قربانی جذبہ ایثار کا تاریخی شاہکار اور شان عبدیت کا ایک اچھوتا کارنامہ ہے کیونکہ اولاد انسان ہی کو نہیں بلکہ جانوروں جیسی بے عقل وشعور مخلوق کو بھی اپنی جان زیادہ عزیز ہوتی ہے اور اولاد کی جان بچانے کے لئے ماں باپ اپنی جان کی بازی لگادیتے ہیں۔

حضرت خلیل اللہ اور حضرت ذبیح اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واقعہ کو تھوڑا سا تاریخی پس منظر پر ڈال کر دیکھئے تو اس کی عظمت وانفرادیت کی جھلک نظر آئے گی حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ازدواجی زندگی پر ایک صدی کے قریب طویل عرصہ گزر جاتا ہے اور ان کی زوجہ مطہرہ حضرت سارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کوئی اولاد نہیں ہوتی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر کی صدی اسی بے اولادی میں پوری ہورہی ہے تب آپ اپنے رب سے دعا کرتے ہیں۔''اے میرے رب بخش مجھ کو کوئی نیک بیٹا''

ترجمہ:۔حق تعالیٰ ان کی دعا سن لیتے ہیں اور فرماتے ہیں ''پھر خوش خبری دی ہم نے ان کو ایک تحمل والے لڑکے کی''(سورہ صافات) چنانچہ سو سال کی عمر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دوسری زوجہ مطہرہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام پیدا ہوئے حضرت سارہ اور حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے مابین حق تعالیٰ کی بعض تکوینی حکمتوں کے پیش نظر ان بن ہوتی ہے اور حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام بحکم

خداوندی ملک شام سے ملک حجاز کی ''وادی غیر ذی زرع'' بے آب وگیاہ لق ودق میدان میں اپنی اہلیہ اور شیر خوار فرزند کو لاتے ہیں اور محض اللہ کے بھروسہ پر تھوڑا سا توشہ حوالہ کر کے حضرت ہاجرہ اور کم سن دودھ پیتے لخت جگر کو اللہ کے بیت الحرم کے پاس چھوڑ جاتے ہیں حق تعالیٰ نے دعائے خلیل کے اس ثمرہ اور اپنی بشارت ''تحمل والے لڑکے'' کی برکت سے وہیں سامان زیست مہیا کر دیا اور خلیل اللہ کے جگر گوشہ کی شدت پیاس سے بیتابانہ ایڑیوں کی رگڑ سے پانی کا ایک ایسا چشمہ سطح زمین پر پیدا کر دیا جو غذائیت اور مائیت دونوں کا کام دے حضرت ابراہیم گاہ بہ گاہ آتے اور اپنے نور نظر کو دیکھ جاتے۔

حق تعالیٰ کے بشارتی لقب کا یہ ''غلام حلیم'' (تحمل والا بردبار لڑکا) شدہ شدہ جب اس قابل ہو گیا کہ اپنے باپ کے ساتھ دوڑ دھوپ کر سکے اور حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعوت توحید اور تبلیغ احکام خداوندی کی توقعات پوری کر سکے تو ۷ ذی الحجہ کو خواب میں یہ ایمائے خداوندی ہوا دیکھا کہ آپ اپنے اکلوتے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں انبیاء کرام کے خواب محض خیالات نہیں بلکہ مبنی بر حقیقت ہوتے ہیں پہلے روز تعبیر کی نوعیت ذہن میں نہ آئی اگلی شب پھر یہی خواب دیکھا تو بھی ذہن کو تر ددر ہا کہ اس کی تعبیر من وعن یونہی ہے یا اس کا کچھ اور مطلب ہے نویں تاریخ ذی الحجہ کو پھر بعینہ وہی خواب نظر آتا ہے تب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یقین ہو گیا کہ امیدوں کے اس اکلوتے سہارے کی قربانی رب ابراہیم کو مطلوب ہے سوچا کہ بیٹے سے ذکر کر کے دیکھوں کہ اس کی کیا رائے ہے خوشی سے اپنی جان کی قربانی کے لئے آمادہ ہوتا ہے یا زبردستی یہ کام کرنا پڑے گا۔ بیٹے سے فرماتے ہیں۔

''اے بیٹے میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں پس دیکھ لو تم کیا رائے دیتے ہو''۔

تحمل والے بیٹے نے فوراً جواب دیا کہ اے باپ کر ڈالئے جو آپ کو حکم دیا جا رہا ہے مجھے آپ انشاء اللہ سہار کرنے والا پائیں گے۔ (سورہ صافات)

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے جگر پارہ کو قربان گاہ پر ساتھ لے گئے باپ بیٹا

خوشی خوشی ایک روایت کے مطابق کہ ''مروہ'' پر گئے بیٹے نے باپ کو مشورہ دیا کہ مجھے لٹا کر ذبح کریئے گا مبادا میرا چہرہ دیکھ کر محبت پدری جوش میں آ جائے۔

معتبر روایت میں آتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ہاتھ باندھ دیئے تاکہ جلد یہ کام انجام دیدیں ایسا نہ ہو کہ ذبح کی تکلیف سے طبعی طور پر مضطرب ہو کر تڑپنے لگیں اور تعمیل حکم خداوندی میں تاخیر ہو یہ منظر دیکھ کر زمین و آسمان اور ان کے بسنے والوں پر کیا گزری وہ کیفیت ناقابل بیان ہے۔ (قرآن کریم نے اس کا کوئی نقشہ نہیں کھینچا اور غالباً اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ہر شخص اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر خود سوچ لے کہ اس جذبہ قربانی کا ارادہ بھی کرے گا تو دل پاش پاش ہو جائے گا اور جو لوگ اس منظر کو دیکھ لیں گے ان کی بے اختیار چیخیں نکل جائیں گی۔

قربانی سے جذبہ اطاعت و بندگی کا اظہار ہوتا ہے

قربانی ایک ایسی عبادت ہے جس کا تصور نوع انسانی کے آغاز سے ہی پایا جاتا ہے۔ خواہ مالی قربانی ہو یا جانی اس عبادت کا بنیادی تصور اپنے معبود کی رضا جوئی اور خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ چنانچہ جتنی قومیں مذہب پر یقین رکھتی ہیں خواہ وہ کسی صحیح مذہب کو مانتی ہوں یا کسی باطل مذہب پر ہوں ایسی تمام قوموں میں مالی قربانی پیش کرنے کا تصور آج بھی پایا جاتا ہے اور جہاں تک جانی قربانی دینے کا تعلق ہے وہ تو ہر وہ شخص اور ہر وہ قوم جو کسی بھی نظریہ پر یقین رکھتی ہو اس نظریہ کے لئے قربانی دیتے ہے لیکن بطور عبادت ان دونوں قوموں کی قربانیوں کا وجود صرف مذہب آشنا قوموں میں ہے قرآن کریم کے بیان کے مطابق دونوں قسم کی عبادت قربانی کا وجود حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ میں بھی تھا چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کی قربانی کا واقعہ حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں بیان فرمایا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے باری تعالیٰ نے فرمایا۔

واتل علیهم ...... اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان کو آدم کے دو بیٹوں کا قصہ ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سنایئے جبکہ ان دونوں نے قربانی پیش کی تو ان میں سے ایک کی قربانی

قبول کر لی گئی اور دوسرے کی قبول نہ کی گئی۔

یہ واقعہ حضرت آدم کے دو بیٹوں قابیل اور ہابیل ہے آٹھ تاریخ کی شب میں خواب دیکھا کہ میں اپنے اس بیٹے کو ذبح کرتا ہوں۔ اگلے دن اسی غور و فکر میں رہے کہ اس خواب کی تعبیر کیا ہے نویں شب میں پھر یہی خواب دیکھا تو یقین ہو گیا کہ حق تعالیٰ کا حکم یہی ہے کہ میں اسے ذبح کر کے قربان کر دوں۔ نو ذی الحجہ کو اس کی تدبیر سوچتے رہے حتی کہ دسویں شب کو پھر یہی خواب دیکھا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مشورے کے طور پر اپنے خواب کا حضرت اسماعیل سے تذکرہ کیا حضرت اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے رضا و رغبت کے ساتھ اپنے والد سے عرض کیا کہ آپ کو جو کچھ حکم ہوا ہے اس کو بجا لایئے مجھے انشاءاللہ آپ ثابت قدم پائیں گے۔

جب حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام دونوں اس حکم خداوندی کی بجا آوری کے لئے بخوشی تیار ہو گئے تو حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ذبح کرنے کے لئے پیشانی کے بل لٹا لیا اور گلے پر چھری چلائی حق تعالیٰ نے چھری کی تاثیر کو روک دیا اور فوراً ندا آئی کہ۔

"اے ابراہیم تم نے اپنا خواب سچ کر دکھایا حق تعالیٰ نے حضرت اسماعیل کے بدلہ ذبح کرنے کیلئے غیب سے ایک دنبہ عطا فرمایا کہ بیٹے کے بدلہ میں اس کو ذبح کر دو یہ تمہارا صرف امتحان تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس قربانی کی عظمت و مقبولیت کے اظہار کے طور پر قرآن کریم میں تفصیل سے اس واقعہ کو ذکر فرمایا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تسلیم و رضا اور فداکاری و جاں نثاری کی یہی وہ سنت ہے جس کی یادگار اور اسی طرح ماہ ذی الحجہ کے مخصوص ایام سے متعلقہ عبادات کی رسمیں حضرت اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد میں قائم رہیں اور قربانی کی اس عبادت کو اس کی اصل شکل میں بالآخر بنی اسماعیل کے فرد وحید اور در یتیم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت تک اپنی امت کے لئے بھی واجب العمل قرار دیا اور خود بھی مدینہ طیبہ میں دس سالہ قیام کے دورن آپ نے ہر سال قربانی کی ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ

میں دس سال قیام کیا ہے آپ قربانی کیا کرتے تھے۔اس حدیث سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ قربانی کا تعلق ایک ضمنی عمل کے طور پر صرف عبادت حج سے ہی نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت ایک عبادت کی ہے نیز یہ کہ اس عبادت کا مقصد محض صدقہ کرنا اور مال خرچ کر دینا ہی نہیں ہے بلکہ قربانی کی عبادت جانوروں کی قربانی کی شکل میں مطلوب ہے۔

چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ یوم نحر میں اللہ کے نزدیک سب سے محبوب عمل جانوروں کی قربانی کرنا ہے پس جس طرح مختلف مالی و بدنی عبادتوں کی شکل و صورت ہر ایک کے مناسب الگ الگ ہے اسی طرح قربانی اور اضحیہ کی غرض و غایت اور اس کی روح بھی جداگانہ ہے جو قربانی کی صورت میں ہی موجود ہوسکتی ہے پھر ہر عبادت کا ایک خصوصی اثر ہوتا ہے جو اس عبادت کو ادا کرنے سے ہی انسان کے قلب و روح میں پیدا ہوتا ہے اسی طرح قربانی کی عبادت کا بھی ایک خاص اثر ہے جو قربانی ادا کرنے سے ہی حاصل ہوسکتا ہے پھر تمام عبادتوں کی ادائیگی کے لئے آمادہ کرنے والا اگرچہ مشترک طور پر جذبہ اطاعت و بندگی ہے لیکن ان احساسات کی نوعیتیں مختلف ہیں اس لئے ان مختلف جذبات کا ظہور بھی عبادتوں کی جداگانہ صورتوں ہی میں ہوسکتا ہے۔

عبادات نماز میں انسان اپنے راحت و آرام وقت اور تکبر و خود بینی کو چھوڑ کر خدا کے سامنے عجز و نیاز کا اظہار کرتا ہے اور اپنے اعضائے جسم میں سب سے زیادہ باعزت چیز سر کو زمین پر رکھ دیتا ہے روزہ رکھ کر اپنی طبعی خواہشات و ضروریات کو اللہ کے احکام کی بجا آوری اور اس کی رضا جوئی کے لئے قربان کر دیتا ہے زکوۃ وغیرہ دے کر مال جیسی محبوب اور پسندیدہ چیز کو اطاعت گذاری کے جذبہ میں اپنے ملک سے نکال دیتا ہے۔عبادت حج میں اپنے راحت و سکون اور آرائش و زیبائش کے جذبہ کو بھینٹ چڑھاتا ہے اسی طرح قربانی کی عبادت میں انسان اپنی جان کے عوض ایک جاندار کو قربان کر کے جانی قربانی پیش کرتا ہے جس طرح اسی مخصوص جذبہ اور احساس قلبی کا اظہار زکوۃ عمل سے نہیں ہوسکتا جو عبادت صلوٰۃ سے وابستہ ہے اور ادائیگی زکوۃ کے خصوصی جذبہ کا مظہر نماز نہیں بن سکتی ٹھیک اسی طرح جانی و مالی قربانی کے مجموعی اور

مخصوص قلبی جذبات و احساسات کا مظہر تنہا مالی صدقہ نہیں ہو سکتا اور نہ قلب پر وہ مجموعی اثر صرف مالی صدقہ کرنے سے مرتب ہو سکتا ہے جس کا تعلق اس مرکب عبادت سے ہے۔

بہر حال اسلام کی ان تمام بنیادی اور اہم ترین عبادات کی حقیقت نہ تو صرف ان کی شکل وصورت ہے اور نہ فقط پنہاں احساسات اور قلبی جذبہ اگر کوئی شخص ان اعمال کی صرف صورت بنالے اور ان کے ساتھ روح ایمانی اور جذبہ اطاعت و بندگی نہ ہو تو یہ سارے عمل بے روح ڈھانچہ اور منافقت ہیں اسی طرح اگر دل میں یہ جذبہ تو ہو مگر اس جذبہ کے اظہار کے لئے جو شکلیں تجویز کی گئی ہیں وہ نہ ہوں تو مقرر کردہ جسمانی اعمال کے بغیر تنہا جذبہ اطاعت و بندگی بے وزن بلکہ آئینی حیثیت سے غیر معتبر ہے مثلاً نماز نہ پڑھنا اس بات کی علامت ہے کہ اس کے دل میں خدا کے حضور عاجزی و بندگی کرنے کا جذبہ نہیں ہے روزہ نہ رکھنا اس کی نشانی ہے کہ یہ شخص خدائے تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری کے لئے اپنی خواہشات کو کچھ دیر کے لئے بھی نہیں چھوڑ سکتا۔

زکوٰۃ اگر کوئی شخص نہیں دیتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کو اللہ کی رضا اور خوشنودی سے زیادہ عزیز اپنا مال ہے اور قدرت و استطاعت کے باوجود حج نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ احکام خداوندی کو اس کی نظر میں کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے پھر ان سب عبادات کو صحیح جذبہ کے ساتھ ادا کرنے سے جیسے عالم آخرت کے بہتر نتائج حاصل ہوتے ہیں اسی طرح دنیوی اعتبار سے بھی ان کے شخصی اجتماعی نوعیت کے بہت سے فوائد ہیں اور ان تمام عبادتوں کا اور حق تعالیٰ کے احکام کی پیروی کا اصل مقصد اور بنیادی غرض و غایت خدا کے حضور اپنی محکومیت و بندگی کا اظہار کر کے اخروی ثمرات و نتائج کو حاصل کرنا ہے لیکن ان کو ادا کرنے سے قدرتی طور پر دنیوی فوائد و اثرات بھی ضرور مرتب ہوتے ہیں لہٰذا قربانی کی قدیم ترین عبادت میں سنت ابراہیمی کا احیا بھی ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اقامت اور آپ کے حکم کی بجا آوری بھی۔

حضرت زید بن ارقم روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ نے دریافت کیا کہ ان قربانیوں کی اصل کیا ہے آپ نے فرمایا تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے صحابہ نے

دریافت کیا ہمارے لئے اس میں کیا اجر ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر بال کے مقابلہ میں ایک نیکی عرض کیا، اور اون، آپ نے فرمایا اون کے ہر روئیں کے مقابلہ میں بھی ایک نیکی۔

غرضیکہ قربانی کی عبادت اپنی اصل نوعیت کے لحاظ سے جان کی قربانی ہے اور ظاہری شکل کے اعتبار سے مال کی قربانی ہے جو خدائے ذوالجلال کی خوشنودی حاصل کرنے اور اس کی رضا جوئی کے لئے ادا کی جاتی ہے پس عیدالاضحیٰ کی مخصوص عبادت قربانی سے ایک طرف مسلمان کے جذبہ اطاعت و بندگی کا اظہار ہوتا ہے اور دوسری طرف اس عمل سے انسان کو حقیقی اور اہم اسلامی مقاصد کے لئے اپنی متاع محبوب مال اور جان عزیز کی قربانی دینے کا سبق حاصل ہوتا ہے۔

مشکلات کا حل خلوص اور اسلامی اخوت

دین اسلام نے اجتماعی زندگی کو امن و اخوت کے ساتھ بسر کرنے کے لئے دنیا میں پہلی بار یہ معاشرتی نظام پیش کیا کہ امت کو معاملات کی انجام دہی میں مکمل طور پر شریک کیا جائے تا کہ ان میں باہمی قربت یگانگت اور ذمہ داری کا احساس پیدا ہو اور اس یقین سے سرشار مطمئن اور متحد رہیں کہ باہمی مشاورت کے نتیجہ میں جو اچھے یا برے واقعات ظہور پذیر ہوئے اس کے وہ خود ذمہ دار ہیں اور ان شاء اللہ مل جل کر ایک نہ ایک دن ترقی و خوشحالی کی منزل حاصل ہو جائے گی۔ جب رب جلیل نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی "ان سے معاملات میں مشاورت کیجئے" کی ہدایت فرمائی تو سوال یہ ہے کہ بھلا خالق کائنات کی زبان یعنی رسالت ماب صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں سے مشورہ کی کیا ضرورت تھی؟ دراصل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث ہی اس لئے کیا گیا تھا کہ اہل ایمان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کو کامل اور واحد نمونہ سمجھتے ہوئے پیروی کریں۔ سورہ شوریٰ میں مزید ارشاد ہوا "اہل ایمان اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرتے ہیں" یہ نہیں کہا گیا کہ کچھ لوگ خود امت سے مشورہ کرلیں اور پھر اس کو تسلیم کریں یا نہ کریں بلکہ فرمان یہ صادر ہوا کہ باہمی مشاورت کے مطابق تمام امور انجام دیئے جائیں تا کہ امت احساس محرومی کا شکار ہو کر افتراق و انتشار میں مبتلا نہ ہو مسند احمد میں حضرت عمر فاروق اعظمؓ سے منقول ہے کہ "جس شخص نے مسلمانوں کی رائے کے بغیر کسی امیر کی بیعت کی اس کی بیعت ہرگز جائز نہیں حضرت علیؓ سے بھی ایک سوال کے جواب میں منقول ہے کہ میری بیعت

مسلمانوں کی مرضی سے ہونی چاہئے غرض اس کو شورائی یا جمہوری نظام کہیں بنیاد ایک ہے یعنی عوام کی رائے وہی جو رب جلیل کا فرمان ہے۔

اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ اسلام کے شورائی یا جمہوری نظام میں ٹکراؤ تشدد یا تضاد نظر آتا ہے تو یہ ایسی ہی بات ہوگی کہ غیر مسلم دنیا ہم مسلمانوں کے اعمال دیکھ کر کہے کہ اگر یہی تمہارا اسلام ہے جہاں جھوٹ، منافقت، فریب اور مسلمان مسلمان کو قتل کرتا ہے تو یہ تمہارا اسلام (نعوذ باللہ) ہرگز اچھا نہیں ہے معلوم ہوا کہ یہ پیروکاروں کے غلط رویئے ہیں جو نظام میں خرابیاں پیدا کرتے ہیں سورہ آل عمران کی ایک آیت کریمہ میں رب جلیل نے دوٹوک انداز میں بیان فرمایا کہ وہ کون سا سرچشمہ تھا کیا نظام اور عمل تھا جس کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کر کے لاکھوں کو مسلمان کیا، ان کو اتحاد واخوت کی لڑی سے منسلک کر دیا اور امن وخوشحالی اور عروج سے ہمکنار کیا، ارشاد ہوا'' اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سخت دل ہوتے تو یہ سب آپؐ کے پاس سے بھاگ جاتے'' گویا یہ محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی نرم مزاجی تھی جس کے سبب لوگوں کی بڑی تعداد آپؐ پر ایمان لائی اور اتحاد واخوت کے رشتہ میں منسلک ہوگئی اور اسی کا فیضان ہے کہ آج کرہ ارض پر شمع رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارب پچیس کروڑ پروانے اور پورے جنوب میں انڈونیشیا سے مراکش تک مسلمانوں ہی مسلمان کی مملکتیں نظر آرہی ہیں۔ رب جلیل نے غیر مبہم الفاظ میں یہ بھی فرمایا کہ اگر ان کے محبوب بھی سخت مزاجی سے کام لیتے تو وہ تن تنہا رہ جاتے اور آج جو فیضان جاری ہے اس کا وجود بھی نہ ہوتا۔ اسی فیضان وسنت سے شرافت ونیکی کا غالب ماحول بنا دیا تھا۔

آیئے جائزہ لیں کہ کیا ہم لوگ نرم مزاج ہیں؟ ظاہر ہے نہیں ہیں تو کیا ہم اپنی سخت مزاجی کے سبب ایک دوسرے سے ذہنی وقلبی طور پر میلوں دور نکل نہیں گئے ہیں اور گھر ہو یا محلّہ شہر ہو یا صوبہ کاروبار ہو یا سیاست غرض ہر جگہ افتراق وانتشار کا شکار ہیں۔

اس سرچشمہ ہدایت سے معلوم ہوا کہ باہمی مسائل کے حل کے لئے تشدد کی بجائے قوانین کا احترام ضروری ہے۔ سورہ مائدہ میں دشمن قوم تک سے قانون کے احترام پر حکم صادر ہوا ہے ارشاد ہوا'' تمہیں کسی قوم کی دشمنی اس میں مبتلا نہ کر دے کہ تم ان کے ساتھ ناانصافی کرنے لگو'' دوسری

جانب ممکن ہے بعض اوقات قانون کی نظریں جرم وظلم تک نہ پہنچیں مگر اسلام کا فرمان اور تجربات کا نچوڑ ہے کہ اس صورت میں بھی قانون کو ہاتھ میں نہ لیا جائے کیونکہ صدیوں کی تاریخ شاہد ہے قانون کو ہاتھ میں لینے کے سبب چند افراد کے بجائے پورا معاشرہ نفرت اشتعال انتقام اور خونریزی کی لپیٹ میں آ جاتا ہے سورہ حم السجدہ میں مزید فرمایا بھلائی اور برائی برابر نہیں ہوا کرتی برائی کا جواب بھلائی سے دو تو جس شخص میں اور تم میں دشمنی تھی وہ تمہارا قلبی دوست ہو جائے گا۔

نرم مزاجی کی اسلامی صفت کا صرف یہی مفہوم نہیں ہے کہ محض میٹھے بول بلکہ دکھ سکھ میں برابر کا شریک رہا جائے۔ یہی اسلام کا بے مثال سوشل سیکورٹی پروگرام ہے اس کی زریں مثال مدنی دور میں انصار نے پیش کی تھی۔ انہوں نے مہاجرین کو خوش آمدید کہا اور اخوت کے جذبہ کے تحت اپنے اثاثوں کا نصف حصہ ان کے سپرد کر دیا اگر اہل مدینہ بخل سے کام لیتے تو مہاجرین میں اپنی ناداری کی بناء پر دشمن کی یلغار روکنے کی سکت نہ ہوتی، اخوت کی اعلیٰ مثال پیش کر کے انصار کو فوری طور پر کچھ عرصہ اپنی املاک میں کمی اور مشکلات کا سامنا ہوا ہوگا مگر بہت جلد ان کے عمل سے معاشرہ دکھ سکھ میں برابر کا شریک ہو گیا۔ اس کے سبب ایک متحد اور طاقتور امت واحدہ دنیا کے اسٹیج پر نمودار ہوئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ مسلمان دنیا پر چھا گئے علاوہ ازیں یہ باہمی کفالت کا عمل ان کے لئے امن و بھائی چارہ کا موثر ترین اور پائدار محافظ ثابت ہوا مشکل یہ ہے کہ ہمارے ارباب ثروت یہ نکتہ سمجھ ہی نہیں پاتے خود بھی ٹینشن میں رہتے ہیں اور ملک وقوم کو بھی خلجان میں مبتلا کر رکھا ہے۔

غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے شورائی نظام اپناتے وقت مذکورہ آیت مبارکہ میں بیان کردہ نرم مزاجی، عفوودرگذر افہام وتفہیم، قانون کا احترام اور دکھ سکھ میں برابر کا شریک رہنے کے رویوں کو ملحوظ خاطر رکھا تو نہ صرف ان کا دور عدل وامن ترقی وخوشحالی اور اتحاد واخوت سے ہمکنار ہوا بلکہ دنیا میں واحد سپر پاور کی حیثیت اختیار کر لی۔ علامہ اقبال نے درست فرمایا۔

یہی فطرت ہے یہی رمز مسلمانی   اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی

قرآن کریم کی تعلیمات

اَلحَمدُ لِلّٰہِ نَحمَدُہٗ وَنَستَعِینُہٗ وَنَستَغفِرُہٗ وَنُؤمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیہِ وَنَعُوذُ بِاللّٰہِ مِن شُرُورِ اَنفُسِنَا وَمِن سَیِّاٰتِ اَعمَالِنَا مَن یَّھدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضلِلہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشھَدُ اَن لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحدَہٗ لَا شَرِیکَ لَہٗ وَنَشھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَولَانَا مُحَمَّدًا عَبدُہٗ وَرَسُولُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیرِ خَلقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصحٰبِہٖ اَجمَعِینَ.

اَمَّا بَعدُ! فَاَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ.

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ.

قرآن کریم کی تعلیمات

جامعہ خیر المدارس ملتان میں اہم تقریر

جامعہ خیر المدارس ملتان کا شمار پاکستان کے مرکزی دینی مدارس میں ہوتا ہے اس کے بانی حضرت مولانا خیر محمد جالندھری تھے جو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے اجل خلفاء میں سے تھے۔ حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی کے حضرت مولانا خیر محمد صاحب سے بڑے گہرے تعلقات تھے اور یہ دونوں حضرات ایک دوسرے کا بے حد احترام واکرام فرماتے تھے، حضرت مولانا تھانوی مرحوم جامعہ خیر المدارس ملتان کی مجلس شوریٰ کے صدر نشین تھے، مولانا مرحوم جامعہ کے سالانہ جلسوں میں تشریف لاتے تھے اور بڑی شان و شوکت سے جامعہ کے سٹیج پر مولانا کا علمی خطاب ہوتا تھا، آپ نے خیر المدارس میں سینکڑوں بار تقاریر فرمائی تھیں جن سے عوام الناس کو بے حد فائدہ پہنچا تھا۔ جامعہ خیر المدارس میں ہونے والی ایک اہم علمی تقریر کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے۔

خطبہ مسنونہ کے بعد مولانا تھانوی مرحوم نے قرآن کریم کی تعلیمات کے موضوع پر ایک ایمان افروز تقریر میں معزز حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔"

"میں مدرسہ عربیہ خیر المدارس کے نام سے اس وقت سے آشنا ہوں جب میں جامعہ قاسمیہ دارالعلوم دیوبند میں ایک ابتدائی معلم تھا، دیوبند سے فراغت کے بعد ایک مرتبہ جالندھر میں بھی مدرسہ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، اور اب تو تقریباً مدرسہ کے سالانہ جلسوں میں ہر سال ہی حاضری کا موقع حق تعالیٰ عطا فرمادیتے ہیں اور حضرت مولانا خیر محمد صاحب مدظلہ کی زیارت بھی نصیب ہوتی رہتی ہے۔ اس مدرسہ کے ابتدائی حالات سے ہی اندازہ تھا کہ کسی روز یہ درسگاہ علم دین کا مرکز اور ایک دینی یونیورسٹی بن جائے گی چنانچہ کامل ۱۸ سال تک یہ مدرسہ جالندھر شہر میں علم دین کی بے مثال خدمات انجام دیتا رہا اور اس قلیل مدت

میں بہت سے فضلا، خطیب، مفتی، مدرسین اور قراء پیدا کئے اور درسگاہ نے ایک امتیازی مقام پیدا کرلیا۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد اس درسگاہ کو بھی نقل مکانی کرنا پڑی بلکہ مدرسہ کے تمام اثاثہ کے لٹ جانے کی وجہ سے تقسیم ملک کے بعد از سرنو زندگی کو شروع کرنا پڑا اور ملتان میں اس درسگاہ کی نشاۃ ثانیہ ہوئی۔ اس وقت بجز حضرت خیر محمد صاحب کی ہمت وحوصلہ کے اور کوئی سرمایہ موجود نہ تھا۔ کچھ روز کے بعد اس درسگاہ نے پھر ایک عربی مدرسہ کی حیثیت اختیار کرلی اور چار پانچ سال کے عرصہ میں علم حدیث کی ایک امتیازی اور مرکزی درسگاہ بن گئی جس میں پنجاب کے علاوہ صوبہ سرحد، بلوچستان اور بنگال و برما کے طلباء کثیر تعداد میں آنے لگے اور علم دین کے اس نایاب چشمہ سے سیراب ہوکر اطراف ملک میں پھیل گئے، حضرت مولانا مہتمم صاحب مدظلہم نے بدلتے ہوئے حالات کا صحیح جائزہ لے کر نہ صرف یہ کہ خیر المدارس کے اندر افتاء وتبلیغ وغیرہ کے شعبے بڑھا دیئے ہیں بلکہ شہر کے چھوٹے بچوں کیلئے ایک پرائمری مدرسہ بھی قائم فرمایا ہے، الحمدللہ یہ عربی مدرسہ علوم دینیہ کی صرف ایک مرکزی درسگاہ نہیں ہے بلکہ پاکستان میں ایک دینی ومذہبی علوم کی بڑی یونیورسٹی ہے۔ جس کے تحت ابتدائی تعلیم سے لے کر درجہ تکمیل تک کے تمام علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں اور بہت سی درسگاہیں اس کی نگرانی میں مصروف کار ہیں۔ اس غیر معمولی ترقی کے باوجود خیر المدارس کے ابھی بہت سے عزائم تشنہ تکمیل ہیں اور جو کثیر رقم اور امداد کے بغیر پورے نہیں کئے جاسکتے اس لئے میں تمام مسلمانوں سے خصوصاً احباب و متعلقین سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ مدرسہ کی سرپرستی فرمائیں مدرسہ کی ترقی کیلئے جدوجہد تیز کریں کیونکہ موجودہ دور میں اسلام کی اشاعت وترویج کیلئے ان دینی مدارس کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ جب انگریزوں نے برصغیر پر غاصبانہ قبضہ کے بعد مسلمانوں کی تہذیب اور ثقافت کو مٹانے کیلئے بہت سے ہتھکنڈے اور حربے استعمال کئے۔ مسلمان علماء کو انسانیت سوز مظالم کا نشان بنایا گیا ان پر طرح طرح کے ظلم وستم روا رکھے گئے۔ مگر علماء کرام نے اسلام اور مسلمانوں کی ترقی کیلئے بڑی قربانی دی اور ان کے مفادات کے تحفظ کو اپنا نصب العین بنایا اور جب انگریز نے دیکھا کہ علماء کرام سامراجی سلطنت کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ

بن گئے ہیں تو انگریزوں نے علماء اور مدارس اسلامیہ کے خلاف کاروائی شروع کر دی لیکن عام مسلمانوں نے عربی مدارس کا ساتھ دیا اور ہر طرح کی قربانی دے کران مدارس کو چلانے میں علماء کی مدد کی اور آج اسلام کی جو رونق نظر آ رہی ہے وہ ان مدارس کی بدولت ہے اس لئے ضروری ہے کہ ان مدارس کو مستحکم بنیادوں پر قائم رکھا جائے اور قرآنی تعلیمات کو عام کرنے میں دلچسپی لیں اور قرآنی تعلیمات پر عمل کریں کیونکہ اس کے بغیر دنیا اور دین کی فلاح ممکن نہیں ہے۔ اور ہمیں اللہ پاک کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ اللہ نے ہمیں وہ کتاب دی جس میں تمام مضامین کو بیان کر دیا گیا ہے اور وہ مضامین بھی ایسے ہیں جنہیں دنیا کے سارے فلسفی بھی مل کر جھٹلا نہیں سکتے۔ قوانین کو لیا جائے تو تمام بنیادی قوانین قرآن حکیم میں موجود ہیں، اخلاقی مسائل کو لیا جائے تو تعلیم اخلاق کا سب سے بڑا سرچشمہ قرآن کریم ہے اور اس قرآنی اخلاق کی حامل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی امت ہے۔ آج جو لوگ اخلاق کی تعلیم دینے کے دعویدار ہیں وہ خود اخلاق کے معنی سے بھی واقف نہیں ہیں۔ فلسفہ یورپ میں صرف باتیں ہی باتیں ہیں عملاً کچھ بھی نہیں ہیں۔

اس کے برعکس قرآن کو ماننے اور پڑھنے والے اخلاق قدروں کے سچے علمبردار ہیں۔ گفتگو کے آداب، کلام کی باریکیاں، بڑوں کا ادب، چھوٹوں پر شفقت، انسانیت کی عزت و احترام، نفس انسان کی عظمت و مرتبت، کون سی بات ہے جو قرآن حکیم نے نہ سکھائی ہو۔ صحابہ کرامؓ، تابعین اور تبع تابعین تو خیر قرآنی اخلاق کے زندہ نمونہ تھے ہی۔ آج سے سو سال پہلے تک مسلمانوں میں قرآنی اخلاق کا اتنا گہرا اثر تھا کہ بڑے بڑے روسا اپنے بچوں کو شریف اور دیندار خاندانوں میں تربیت کیلئے بھیجا کرتے تھے۔ نئی دہلی میں ایک بہت بڑے افسر تھے نہایت بلند اخلاق، منکسر المزاج تہجد گزار، بڑے مہذب، بڑے شائستہ اور بڑی نرم طبیعت کے مالک تھے، انہیں دیکھ کر مجھے تعجب ہوتا تھا کہ اتنے بڑے افسر اور اس درجہ خاکساری لیکن ایک مرتبہ انہوں نے خود ہی بتایا کہ بچپن میں ان کے والدین نے انہیں حکیم اجمل خان مرحوم کے مکان پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ ان سے اخلاق کی عملی تربیت حاصل کریں۔ چنانچہ ان میں حکیم صاحب کی ساری خوبیاں موجود تھیں۔ گویا قرآن بہترین

معلم اخلاق ہے آداب مجلس ہی کو لیجئے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ''
''اے ایمان والو! اگر تمہاری مجلس میں کوئی آئے تو اس کے لئے جگہ کر دو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے جنت میں جگہ کر دے گا'' یہ اس لئے ارشاد ہوا کہ ہمیں کسی کو حقیر سمجھ کر مجلس میں نہ بٹھانے کی جرات نہ ہو۔ اسی طرح انسان اور انسانیت کا احترام قرآن حکیم میں اس حد تک سکھایا گیا ہے کہ اگر مجلس میں تین آدمی بیٹھے ہوں تو ان میں سے دو آدمیوں کو آپس میں سرگوشی بھی نہیں کرنی چاہئے تا کہ تیسرے کو یہ گمان نہ گزرے کہ شاید اس کے خلاف کوئی بات کی جا رہی ہے گویا قرآن اور اسلام کو کسی کی اتنی بھی دل شکنی گوارہ نہیں ہے۔

قرآنی اخلاق سے آراستہ ہو کر ہی عرب کے شتربان تھوڑی ہی مدت میں دنیا کے سب سے بڑے حکمران بن گئے۔ دنیا کی کوئی کتاب اور کوئی تعلیم اتنی قلیل مدت میں اتنا بڑا اخلاق انقلاب برپا نہیں کر سکی۔ کہنے والے نے کیا خوب کہا ہے۔

درفشانی نے تیری قطروں کو دریا کر دیا
دل کو روشن کر دیا آنکھوں کو بینا کر دیا
خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو بھی زندہ کر دیا

۲۳ سال کی مدت قوموں کی زندگی میں ایک دقیقہ کا بھی درجہ نہیں رکھتی۔ بیروت کے ایک عیسائی عالم نے اسی ہمہ گیر انقلاب کی بدولت قرآن کریم کی صداقت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قرآن کا آسمانی کتاب ہونا برحق ہے اس لئے کہ انسان کی لکھی ہوئی کوئی کتاب کبھی اتنا ہمہ گیر اور دیرپا انقلاب ہرگز ہرگز برپا نہیں کر سکتی، جذبات کو ابھارنے کی جتنی قوت قرآن کریم میں ہے اس کا کوئی تحریر مقابلہ ہی کیا کرے گی۔ ایک بار جس نے قرآن کریم کے معنوں پر غور کر لیا اس کی دنیا ہی بدل گئی۔ ایک وقت تھا جب فضیل بن عیاض ڈاکو تھے اور ڈاکو بھی ایسے نامور کہ اعلان کر کے ڈاکہ ڈالا کرتے تھے ایک رات وہ اسی نیت سے مکانوں کی چھتوں سے گزر رہے تھے کہ ایک روزن سے انہیں کچھ آواز آئی۔ انہوں نے کان

روزن سے لگا دیئے۔ گھر میں کوئی شخص قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا۔ آیت کا مطلب تھا۔

''کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ تو اللہ کے قرآن کے آگے جھک جائے۔''

ان الفاظ میں کیا تاثیر تھی۔ تیر کی طرح فضیل کے دل میں اتر گئے، ایک دم نعرہ مارا ہائے میرے اللہ۔ نہ صرف اسی وقت انہوں نے چوری سے توبہ کر لی۔ بلکہ اپنی ایسی اخلاقی اصلاح کی آج ان کا شمار صلحائے امت میں ہوتا ہے۔ امام اصمعی کا واقعہ ہے وہ جنگل سے گزر رہے تھے کہ ڈاکوؤں نے آن گھیرا اور ان کی تلاشی لینے لگے وہ ذرا نہ گھبرائے اور ڈاکوؤں سے پوچھا تم ایسا کیوں کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارا رزق آسمانوں میں مقرر کر دیا ہے وہ تمہیں مل کر رہے گا۔ ڈاکو اس آیت کے سنتے ہی انہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ تین سال کے بعد جب امام اصمعی خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے تو کوئی آ کر فرط محبت سے ان سے لپٹ گیا وہ پہچان نہ سکے اس پر اس شخص نے بتایا آپ کو ڈاکوؤں کا وہ واقعہ یاد ہے۔ میں انہیں ڈاکوؤں میں سے ایک ہوں۔ یہ تھا قرآنی انقلاب اور قرآنی تعلیمات کا نتیجہ۔ لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ الحمدللہ پچھلے بیس سالوں میں ہمارے ہاں عظیم الشان مادی اور صنعتی ترقی ہوئی ہے تاہم یہ امر تکلیف دہ ہے کہ اخلاقی اور روحانی طور پر ہم پہلے سے بھی گر گئے ہیں۔ طرح طرح کی اخلاقی اور روحانی بیماریاں ہم میں گھر کر چکی ہیں۔ ان تمام بیماریوں کا واحد علاج یہی ہے کہ ہم قرآن کریم کا دامن مضبوطی سے تھام لیں اور قرآنی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر اپنے رب کو راضی کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نیک عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

(ہفت روزہ صوت الاسلام لاہور)

عمل کا معیار

اَلحمدُ لِلّٰہِ نَحمَدُہٗ وَنَستَعِینُہٗ وَنَستَغفِرُہٗ وَنُؤمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیہِ وَنَعُوذُ بِاللّٰہِ مِن شُرُورِ اَنفُسِنَا وَمِن سَیِّاٰتِ اَعمَالِنَا مَن یَّھدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضلِلہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشھَدُ اَن لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحدَہٗ لَا شَرِیکَ لَہٗ وَنَشھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَولَانَا مُحَمَّدًا عَبدُہٗ وَرَسُولُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیرِ خَلقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصحٰبِہٖ اَجمَعِینَ۔

اَمَّا بَعدُ! فَاَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ۔

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ۔

عمل کا معیار

بزرگان محترم اور برادران عزیز!

یہ میرے لئے انتہائی سعادت کا مقام ہے کہ اللہ نے مجھے آج یہ توفیق عطا فرمائی کہ میں آپ حضرات کے درمیان کچھ دیر کے لئے۔ دین کے اوپر اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے ذکر پر کچھ عرض کرنے کے لئے میں حاضر ہو گیا۔ گو کہ اس بات کا دعویٰ نہیں کرتا کہ میں آپ کے سامنے کوئی لمبی چوڑی یا طویل تقریر یا بیان کر سکوں۔ لیکن اللہ سے اس بات کی امید رکھتا ہوں اور اس بات کی دعا کرتا ہوں کہ جو بات میرے منہ سے نکلے اللہ تعالیٰ اسے حق پر رکھے۔

رات کا اچھا خاصا وقت گزر چکا ہے اور موسم کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جتنی جلد از جلد گفتگو ہو سکے۔ خلق خدا کو اسی میں سہولت ہے۔

آج میں جو بات کہنے کے لئے حاضر ہوا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمارا کونسا عمل اللہ کے یہاں قابل قبول ہے اور کونسا عمل قابل قبول نہیں ہے۔ کیونکہ ہماری اور آپ کی عمر اور زندگی یہ اللہ تعالیٰ کا اتنا قیمتی دیا ہوا سرمایہ ہے کہ میرے دوستو! اگر یہ سرمایہ ایک دفعہ ہمارے ہاتھ سے چلا گیا تو دوبارہ واپس آنے والا نہیں ہے۔ اور ہمیں اور آپ کو یہ اہتمام کر لینا چاہئے کہ یہ سرمایہ جو اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ جو ہمیں ملی ہوئی ہے۔ زندگی کے جو یہ چند لمحات ہیں۔ ہمیں اور آپ کو چاہئے کہ ان کی قدر و منزلت اور ان کے مقام کو پہچانیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مستقل ایک سورت نازل فرمائی ہے۔ جس کا تعلق وقت اور زمانے سے ہے فرمایا کہ۔

والعصر ان الانسان لفی خسر.

قسم ہے زمانے کی۔ قسم ہے وقت کی۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ اللہ

نے یہاں وقت اور زمانے کی قسم کیوں کھائی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حج بیت اللہ کے لئے گیا اور زیارت نبوی کے لئے مدینے میں حاضری ہوئی۔ میں اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا دوپہر کا وقت تھا۔ ایک لڑکا برف بیچ رہا تھا اور وہ ایک نعرہ لگا رہا تھا۔ آپ نے پاکستان میں بھی اور ہندوستان میں بھی یہ دیکھا ہوگا۔ یہ رواج ہے کہ ہر بیچنے والا ایسا نعرہ لگاتا ہے کہ سننے والا متوجہ ہو کے اس کا مال خریدے۔

کہتے ہیں کہ دہلی میں ککڑیاں بیچنے والے نعرہ لگاتے تھے۔ لیلیٰ کی انگلیاں اور مجنوں کی پسلیاں یعنی جس طریقے پر ایک محبوب کی انگلیاں نازک اور پتلی پتلی ہوتی ہیں۔ یہ ککڑیاں بھی ویسی ہی ہیں۔ جس طریقے پر ایک عاشق فراق یار میں گھٹ گھٹ کر دبلا اور پتلا ہوجاتا ہے۔ سوکھ جاتا ہے ایسے طریقے پر میری ککڑیاں بھی ہیں۔

تو میں نے عرض کیا کہ ہر بیچنے والا ایسا نعرہ لگاتا ہے کہ سننے والا متوجہ ہو کے مال خرید لیتا ہے۔ یہ لڑکا بھی ایک نعرہ لگا رہا ہے اور کہتا ہے کہ۔ ارحموا من یذوب راس مالہ

اے لوگو جلدی جلدی سے اپنے گھروں سے نکلو اور دوڑو۔ میرا مال میری ملکیت ایسی چیز ہے کہ اگر آپ نے خریدنے میں دیر کی تو یہ گھل گھل کے ختم ہوجائے گا۔

میرے دوستو! بعضے پونجی بڑی نازک ہوتی ہے۔ ایک شخص گاؤں کا آدمی اپنی کمر پر باریک باریک نازک چوڑیاں ایک پوٹلی کے اندر لے جارہا تھا ایک پولیس والے نے ڈنڈا مار کے پوچھا۔ اس میں کیا ہے۔ اس آدمی نے یہ جواب دیا کہ ایک اور مار دے۔ تو کچھ بھی نہیں۔ ارے ظالم! تجھے یہ معلوم نہیں یہ مال جو میں لے کے جارہا ہوں اور یہ پونجی جو میرے پاس ہے اتنی نازک ہے۔ تو ڈنڈا مار کے پوچھ رہا ہے۔

دوسرا ڈنڈا مار دے تو کچھ بھی نہیں۔ آپ نے اندازہ لگایا بعض پونجیاں اتنی نازک ہوتی ہیں۔

حضرت مولانا تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نے لطیفے کے طور پر ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ جس زمانے میں شروع شروع میں برف بکا ہے۔ تو گاؤں والے تو برف سے واقف نہیں تھے۔ گاؤں کا ایک آدمی جو شہر کے اندر کام کرتا تھا اس نے برف خریدا اور گاؤں میں اپنے گھر بھجوا

دیا۔اس کی بیوی نے یہ سوچا کہ یہ آج شوہر نے میرے لئے ایک نئی سوغات بھیجی ہے اور میرا شوہر ہے وہ تو اتوار کی چھٹی پر آتا ہے۔اس نے اس برف کو اٹھا کر بوری میں لپیٹ کے رکھ دیا اور یہ کہا کہ جب میرا شوہر آئے گا اس وقت میں اس کو نکال لوں گی۔

اب اتوار کے دن یہ شوہر گھر آئے۔اس نے کہا میں نے تمہیں ایک چیز بھیجی تھی۔ برف کہلاتی ہے۔تم نے کھائی۔وہ بیوی کہتی ہے کہ نہیں ہم تو اس انتظار میں تھے کہ آپ آئیں گے تو سب مل بیٹھ کے کھائیں گے اس آدمی نے سر پکڑ لیا اس نے کہا ارے ظالم یہ تو نے کیا کیا۔

حضرت مولانا تھانوی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں جا کے دیکھا تو کفن تو موجود ہے اور اس کے اندر سے مردہ غائب ہے۔یعنی جس کپڑے کے اندر وہ برف لپیٹ کے رکھ دیا تھا۔وہ کپڑا تو موجود ہے لیکن برف پگھل پگھل کے ختم ہو گیا ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جب میں نے یہ نعرہ سنا میری سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ اللہ نے سورۃ والعصر میں وقت اور زمانے کی قسم کیوں کھائی ہے۔

اس سورۃ میں ایک پروگرام بتایا گیا ہے کہ اے مسلمانو یہ تمہاری عمر اور زندگی جو ہے۔یہ ایک برف کی طرح پر ہے۔تم اس زندگی سے فائدہ اٹھاؤ اور جلدی سے اس کو ایمان اور عمل صالح میں لگا دو۔ورنہ یہ گھٹ گھٹ کے ختم ہو جائے گی۔

اور میرے دوستو ہم اور آپ آج بہت فخر کے ساتھ Birth Day (سالگرہ) مناتے ہیں۔میرے دوستو ذرا سوچئے اور غور کیجئے کہ یہ ہم اور آپ سالگرہ کس لئے مناتے ہیں۔کیا اس بات کی ہم خوشی مناتے ہیں کہ اگر ہمارے لڑکے کی عمر اگر ۱۶ سال کی ہو گئی ہے تو اس کے عمر کے ۱۶ سال کم ہو گئے۔اگر ہمارے لڑکے کی عمر اللہ تعالیٰ نے ۵۰ سال لکھ دیئے ہیں اگر ۲۰ سال کی عمر میں آپ سالگرہ منا رہے ہیں تو کیا ۵۰ سال سے جو ۲۰ سال کم ہو گئے ہیں۔اس کی خوشی منا رہے ہیں۔یہ سب سے بڑی حماقت ہے۔کسی عارف نے بڑی اچھی بات کہی۔فرمایا

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی گردوں نے گھڑی عمر کی ایک اور گھٹا دی

یاد رکھئے یہ جو گھنٹہ بول رہا ہے۔یہ سوئیاں جو چل رہی ہیں۔اس کے چلنے سے آپ ذرا

عبرت حاصل کیجئے۔تمہاری زندگی کا ایک ایک لمحہ کم ہوتا جا رہا ہے۔لیکن اس کے باوجود ہم اور آپ آج یورپ کی تقلید میں آنکھیں بند کر کے ہر وہ کام کئے جا رہے ہیں کہ جو اسلام کے سراسر عین خلاف ہے۔

اور یہ بالکل اسی طریقے پر ہے۔جیسے بعض اوقات قوالی میں بغیر کچھ سوچے سمجھے کسی کو حال آ جاتا ہے۔ایک قوال گا رہا تھا۔

بے کارم وبا کارم چوں بہ حساب اندر　　　　ایں طرفہ تماشا بین دریا بہ حباب اندر

ایک صاحب کو حال آ گیا اور وہ حال میں کہتے جا رہے ہیں۔واہ واہ، دریا میں بہا بندر، دریا میں بہا بندر۔لوگوں نے کہا ارے ظالم یہ کیا کہہ رہا ہے۔قوال نے تو ایسا کہا نہیں۔اس نے کہا کہ بے شک قوال نے یہ نہیں کیا ہوگا۔لیکن مجھے تو حال اس بات پر آیا ہے کہ جس وقت بندر دریا میں نہا رہا ہوگا تو اسے کتنا مزہ آ رہا ہوگا۔

آپ نے اندازہ لگایا۔ہم اور آپ آنکھیں بند کر کے یورپ کی تقلید کرتے ہیں میرے دوستو یہ صحیح نہیں ہے۔اور ہمارے ہاں کے پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ نوجوان یہ درحقیقت اسلام کے باغی نہیں ہے بلکہ ان کا سوچ اور ان کی فکر کا اندازہ دوسرا ہے۔اور یاد رکھئے اگر ہماری فکر اور سوچ کا انداز صحیح ہوگا تو ہم کسی اور نتیجے پر پہنچ جائیں گے۔اور اگر یہ انداز غلط ہوگا تو نتیجہ کچھ اور ہوگا۔

مفکرین نے لکھا ہے کہ جس وقت انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا آخری وقت آتا ہے تو اللہ کی طرف سے جبرئیل امین کو بھیجا جاتا ہے۔جایئے جا کر کہہ دیجئے کہ آپ کا وقت آ چکا ہے۔اگر آپ اجازت دیں تو آپ کی روح قبض کی جائے۔یہ اختیار ہر نبی اور ہر پیغمبر کو دیا جاتا ہے۔جب حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس جبرئیل امین آئے اور کہا کہ آپ اجازت دیں تو ہم ملک الموت سے کہیں کہ وہ آپ کی جان نکال دے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ اے ملک الموت تم میرے دوست ہو اور میں تمہارا دوست ہوں۔کیا کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ دوست دوست کی جان نکالتا ہے۔ملک الموت کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔وہ خاموش ہو گیا۔اور جا کر بارگاہ خداوندی میں یہ بات کہہ دی۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جاؤ۔ ہماری طرف سے کہہ دو کہ کیا کوئی دوست اپنے دوست سے ملاقات کو بھی ناپسند کرتا ہے۔ اے ابراہیم ہم تمہارے دوست ہیں تم ہمارے دوست ہو۔ کیا کوئی دوست بھی ایسا ہوتا ہے کہ جو دوست کی ملاقات کو ناپسند کرے۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہنسنے لگے۔ خوش ہو گئے اور فرمایا کہ اب تم میری جان نکال دو۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اگر سوچنے کا اور فکر کرنے کا انداز ہمارا صحیح ہو تو ہم اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ جس پر اسلام ہمیں لے جانا چاہتا ہے۔ لہٰذا آج کل جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ارے میاں کیا حرام کیا حلال کیا جائز کیا ناجائز اصل میں تو انسان کی نیت نیک ہونی چاہئے۔ نیت ٹھیک ہونی چاہئے۔

میرے دوستو! اگر آپ نے صرف یہی سوچ لیا کہ ہماری نیت ٹھیک ہونی چاہئے تو یہ سب سے بڑی گمراہی ہے۔

اور یہ زندگی کا سرمایہ جو اللہ نے ہمیں عطا فرمایا ہے، یہ اس طرح پر ہماری پوری زندگی ختم ہو جائے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قسم اٹھائی ہے رات کی اور دن کی۔ تاریکی کی اور روشنی کی۔ فرمایا کہ

والیل اذا یغشی والنھار اذا تجلی وما خلق الذکر والانثیٰ.

اللہ تعالیٰ نے رات کی اور دن کی، تاریکی اور روشنی کی قسم کھا کر فرمایا۔ یہ دنیا اضداد کی جگہ ہے۔ یہاں ہم نے رات کو بھی پیدا کیا اور دن کو بھی پیدا کیا ہے۔ اور یہاں ہم نے نور ایمان بھی پیدا کیا ہے اور ظلمت کفر بھی پیدا کی ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے درختوں میں بھی۔ جمادات کے اندر بھی۔ انسانوں کے اندر بھی نر اور مادہ پیدا کئے ہیں۔ جس طریقے پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں حیوانوں میں اضداد کو پیدا کیا ہے۔ اسی طریقے پر یہ ہمارے عمل بھی الگ الگ اور مختلف اور متضاد ہیں۔ بالکل اسی طریقے پر ایک سخی اور دولت مند آدمی وہ اپنی دولت سے بہت سے نیک کام کرتا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی دولت سے مسجد بنواتے ہیں اور ایک شخص

ایسا ہے کہ جو اپنی دولت کو اللہ اور اس کے رسول کی دشمنی میں استعمال کرتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ سب انسانوں کے عمل مختلف اور متضاد ہوتے ہیں۔

اور ہم آپ کو ایسی مثال بھی دے سکتے ہیں کہ عمل ایک ہی ہے۔ لیکن اس کے نتیجے مختلف ہیں، کس طریقے پر، حدیث میں آتا ہے۔ شہداء کی ایک جماعت اللہ کے سامنے پیش کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ آپ زاد آخرت کے لئے کونسا عمل لے کے آئے ہیں۔ وہ جواب دیں گے اے اللہ دولت ہمارے پاس نہیں تھی جو ہم لوگوں میں تقسیم کرتے۔ علم ہمارے پاس نہیں تھا جو ہم لوگوں کو تبلیغ کا کام کرتے اے اللہ تو نے ہمیں ایک جان دے دی تھی وہ ہم تیری راہ میں لٹا کر آئے ہیں اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کذبت۔ تو نے جھوٹ بولا۔ تو نے جان اس لئے دی تھی کہ تیرے خاندان اور قبیلے میں تیرا نام ہو کہ لوگ یہ کہیں کہ کتنا بہادر اور شدید انسان تھا۔ فرمایا کہ وہ بدلہ تجھے دنیا میں مل چکا ہے۔ آخرت میں تیرے لئے کوئی گنجائش نہیں۔

اسی طریقے پر علماء کی ایک جماعت پیش کی جائے گی۔ اور میرے دوستو! علماء قابل تعظیم اور قابل احترام ہوتے ہیں اور یہ میں نے اس لئے کہا کہ عالم اگر صحیح نہ ہو تو آپ بے شک اس کے فتویٰ پر عمل نہ کریں۔ لیکن اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ اس عالم کی آپ توہین کریں اور اس کو گالی دیں۔

حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مثال کے ذریعے سے یہ بات سمجھائی ہے فرمایا کہ اگر ایک قرآن کریم پریس کے اندر چھپ رہا ہے اور وہ غلط چھپ جائے۔ تو ایسے قرآن کریم کے اندر تلاوت کرنا جائز نہیں لیکن اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ جو قرآن کریم غلط چھپ گیا ہے آپ نعوذ باللہ اس کے اوپر پیر رکھ کر کھڑے ہو جائیں۔ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ کیوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر آپ آج ایسے قرآن کریم کی بے حرمتی کریں گے کہ جو غلطی سے چھپ گیا ہے۔ میرے دوستو! دیکھنے والے یہ نہیں سوچیں گے کہ یہ غلط ہے یا صحیح ہے۔ وہ صحیح قرآن کریم کی بھی بے حرمتی کریں گے۔

بالکل اسی طریقے پر اگر عالم صحیح نہیں ہے۔ آپ بے شک اس کے فتویٰ پر عمل نہ کریں۔

لیکن میرے دوستو! اس عالم کے لئے، اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ کیونکہ لوگ اس بات کی تحقیق نہیں کریں گے کون عالم صحیح ہے کون غلط ہے۔ وہ تو پھر ہر ایک عالم کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکیں گے اور اس سے اسلام کو اور مسلمانوں کو نقصان پہنچے گا۔

علماء کی جماعت پیش کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ آپ زاد آخرت کے لئے کونسا عمل لے کر آئے ہیں وہ یہ کہیں گے کہ اے اللہ دولت ہمارے پاس نہیں تھی جو ہم خرچ کرتے۔ جہاد کا موقع ہمیں ملا نہیں تھا کہ جو ہم اپنی جان کو آپ کی راہ میں لٹا دیتے۔ آپ نے ہمیں علم دیا تھا۔ ہم نے جگہ جگہ درس و تدریس کا کام کیا ہے۔ تبلیغ کا کام کیا ہے۔ بس یہی ایک عمل ہے۔ اے اللہ ہمارے پاس صرف یہی عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کذبت۔ تو نے جھوٹ بولا۔ اس لئے کہ تو نے درس دیا تھا تبلیغ کی تھی لیقال انک عالم جید۔ کہ دنیا یہ کہے کہ یہ بہت ہی متبحر عالم ہے اور وہ بدلہ تمہیں دنیا میں مل چکا ہے۔ آخرت میں تمہارے لئے کوئی بدلہ نہیں۔

اسی طریقے پر ایک جماعت دولت مند اور سخی لوگوں کی پیش کی جائے گی اللہ تعالیٰ ان سے بھی یہی سوال فرمائیں گے۔ میرے دوستو! آج بہت سے لوگ اللہ کی راہ میں اس طریقے پر دیتے ہیں وہ زمانہ نہیں کہ دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ بلکہ اس کی تشہیر کرتے ہیں۔ ڈھول بجا بجا کے دولت لوگوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔

سخی اور دولت مند یہ جواب دیں گے۔ اے اللہ علم ہمارے پاس نہیں تھا کہ جو ہم لوگوں کو تبلیغ کرتے۔ جہاد کا موقع نہیں ملا تھا کہ ہم اپنی جان کو آپ کی راہ میں لٹا دیتے۔ آپ نے ہمیں دولت دی تھی اور وہ دولت ہم نے آپ کے مفلس بندوں میں حاجتمندوں میں تقسیم کی ہے۔ خیرات کا کام ہم نے کیا ہے۔ اللہ تعالی فرمائیں گے تم نے جھوٹ بولا اس لئے کہ تم نے سخاوت کا جو عمل اختیار کیا تھا۔ اس لئے کیا تھا کہ لوگ یہ کہیں گے کہ دیکھئے یہ کتنے سخی اور کریم ہیں فرمایا کہ اس عمل کا بدلہ آپ کو دنیا میں مل چکا ہے۔

آپ نے دیکھ لیا عمل ایک ہی ہے لیکن نتیجہ مختلف۔ مجھے علامہ اقبال مرحوم کے دو شعر یاد آگئے۔ فرمایا کہ ؎

احوال ومقامات پہ موقوف ہے سب کچھ ہر لحظہ ہے سالک کا زماں اور مکاں اور

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں کرگس کا جہاں اور ہے شاہین کا جہاں اور

آپ نے دیکھا ہوگا۔ کرگس، گدھ، وہ بھی اسی ہوا میں اڑتا ہے۔ شاہین بھی اسی ہوا میں اڑتا ہے۔ لیکن میرے دوستو! گدھ کی اور شاہین کی منزل الگ الگ ہے۔ گدھ مردار پر ہاتھ ڈالتا ہے اور شاہین شکار زندہ کی تلاش میں رہتا ہے۔

اوراس سے زیادہ واضح مثال سنئے۔ فرمایا کہ

الفاظ ومعانی میں تفاوت نہیں لیکن ملا کی اذان اور مجاہد کی اذان اور

آپ نے دیکھا ایک ہی الفاظ ہیں ایک ہی معنی ہے اور ایک ہی جگہ ہے کہ جہاں پر اذان دی جارہی ہے لیکن میرے دوستو! ایک شخص کی اذان براہ راست اللہ کے یہاں قابل قبول ہے اور ایک شخص کی قابل قبول نہیں ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ بعض اوقات عمل ایک ہوتا ہے لیکن اس کے نتیجے مختلف ہوتے ہیں۔

میرے دوستو! اللہ نے بعضے اعمال ایسے بنائے ہیں کہ ان کی تاثیر دنیا میں برابر برابر رکھی ہے۔ کوئی فرق نہیں ہے۔ یعنی اگر ایک مسلمان سچ بولے گا۔ اس کا اعتماد قائم ہو جائے گا۔ لیکن اگر ایک کافر سچ بولے گا تو اس کا اعتماد بھی قائم ہو جائے گا اگر ایک مسلمان امانت میں خیانت نہیں کرے گا لوگوں کے دل میں اس کی عظمت بڑھے گی لیکن اگر ایک غیر مسلم امانت میں خیانت نہیں کرے گا تو لوگوں کے دل میں اس کی بھی عظمت بڑھے گی۔ بالکل اسی طریقے پر بلکہ آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ اگر ایک مسلمان خمیرہ مروارید کھائے تو اس کے اندر تو طاقت بڑھے اور اگر ایک کافر کھائے تو مر جائے۔ ایسا نہیں ہوگا۔ لیکن بعض اوقات ایسے عمل ہوتے ہیں کہ اگر وہ مسلمان کرتا ہے اس کا اثر دنیا میں ظاہر ہوتا ہے اور اس کا اثر اور نتیجہ دونوں برابر ہوتے ہیں۔ کافر اور غیر مسلم اگر وہ عمل اختیار کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ اور اثر بھی برابر ہوتا ہے۔ لیکن فرمایا کہ ایک عمل وہ ہے کہ جس کا اثر آخرت میں ظاہر ہوگا۔ دنیا میں ظاہر نہیں ہوگا۔ وہ ہے کافر کا عمل۔ کیونکہ کافر کا عمل اس طریقے پر ہے کہ جیسے دور سے ریت کے اندر آپ دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے پانی ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ جائے اور پئے۔ لیکن

قریب جا کے دیکھتا ہے تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

والذین کفروا اعمالھم کسراب بقیعۃ یحسبہ الظمآن مآء

کافر کا جو عمل ہے وہ اس طریقے پر ہے کہ جیسے دور سے دیکھیں ریت پر پانی نظر آ رہا ہے۔لیکن جس وقت کافر آخرت میں پہنچے گا۔کسی کافر نے لاکھ نیکیاں کی ہوں۔ ہزاروں اس نے بھلائی کے کام کئے ہوں۔لیکن اس کا اثر دنیا تک رہے گا۔آخرت میں اس کا اثر ظاہر نہیں ہوگا۔اس کی مثال یہ ہے کہ آپ اگر زیرو زیرو لگائیں تو آپ دیکھیں گے یہ کوئی رقم نہیں ہے۔زیرو رقم اس وقت بنتا ہے جبکہ اس کے الٹے ہاتھ کے اوپر کوئی فگر **(Figure)** یا ہندسہ لگایا جائے۔زیرو زیرو لگائیں۔ایک کا ہندسہ لگائیں گے۔اب یہ رقم بنے گی۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ درحقیقت ایمان کی مثال ایسی ہے جسے فگر اور ہندسہ ہوتا ہے۔ کافر کا عمل چاہے اس کے اندر نیکیاں اور خوبیاں ہوں لیکن اس کی مثال ایسی ہے جیسے زیرو، زیرو۔صفر،صفر،اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔مسلمان کا عمل آخرت میں اس لئے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے پاس ایمان جیسی دولت ہے۔

تو میرے دوستو!اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں یہی بات فرمائی ہے۔فرمایا کہ۔

فاما من اعطیٰ واتقیٰ وصدق بالحسنیٰ فسنیسرہ للیسریٰ.

فرمایا کہ اگر کسی شخص کے پاس ۳ چیزیں جمع ہو جائیں۔ایمان،عمل صالح،یعنی وہ عمل جو سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یا اللہ نے کرنے کو بتایا ہے،اور ایک اس کی نیت ٹھیک ہونی چاہئے۔

فرمایا کہ جس شخص کے اندر یہ تینوں اجزاء جمع ہو جاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتے ہیں فسنیسرہ للیسریٰ۔ پھر ہم اس شخص کو جنت میں داخل کر دیں گے اور جنت کی نعمتوں کے اندر وہ شخص ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہے گا۔

میرے دوستو!بس یہی ایک عمل کے قبول ہونے یا وہاں سے رد کرنے کے لئے یہی معیار ان آیتوں میں بتایا گیا ہے بس اب میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔دعا کیجئے کہ ہم کو اور آپ کو سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔

مشتاق احمد عفی عنہ

اسلامی اخلاق

اَلحمدُ لِلّٰہِ نحمَدُہٗ وَنَستَعِینُہٗ وَنَستَغفِرُہٗ وَنُؤمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیہِ وَنَعُوذُ باللّٰہِ مِن شُرُورِ اَنفُسِنَا وَمِن سَیِّاٰتِ اَعمَالِنَا مَن یَّھدِہِ اللّٰہُ فَلا مُضِلَّ لہٗ وَمَن یُّضلِلہُ فَلا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشھَدُ اَن لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحدَہٗ لا شَرِیکَ لَہٗ وَنَشھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَولَانَا مُحَمَّدًا عَبدُہٗ وَرَسُولُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیرِ خَلقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصحٰبِہٖ اَجمَعِینَ.

اَمَّا بَعدُ! فَاَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ.

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ.

اسلامی اخلاق

جناب صدر معزز خواتین وحضرات

آج یہ دوسری نشست ہے جو کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک کے سلسلے میں منعقد کی گئی اور مقصد ایک ہی ہے۔ وہ یہ کہ ہم مسلمان ایک تو اظہار محبت کریں اور دوسرے یہ کہ ہم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور آپؐ کی سیرت طیبہ کے اوپر کچھ بیان سنیں اور سننے کے بعد عمل کرنے کی کوشش کریں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ بات عرض کرنی ہے کہ ہم اور آپ اپنا زیادہ تر وقت اگر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ہم اپنی صورتوں کے بنانے میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں۔ یہ زمانہ اصل میں صورت سازی کا زمانہ ہے۔ صورت گری کا زمانہ ہے۔ سیرت سازی کا نہیں۔

لیکن اب دیکھئے کہ ہمارا اور آپ کا حال یہ ہے ہر جوان، ہر شخص زیادہ تر وقت اپنی صورتوں کے بنانے میں لگا رہا ہے۔ کوئی اپنے چہرے کو سنوار رہا ہے۔ کوئی اپنے بالوں کو سنوار رہا ہے۔ کوئی اپنے جسم کی خدمت کرتا ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھئے کہ ہم اپنی صورتوں کو چاہے کتنا ہی حسین بنا دیں۔ سنوار لیں چاہے کتنا ہی سنگھار کر لیں اس سے زیادہ حسین نہیں بنا سکتے کہ جتنا حسین اللہ تعالیٰ نے ہمیں اور آپ کو پیدا کیا ہے۔

حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے زمانے میں ایک عورت آئی اور اس نے یہ کہا کہ حضرت! میرے شوہر نے مجھ کو طلاق دے دی اور یہ کہہ کر مجھے طلاق دی ہے اگر تم چاند سے زیادہ حسین نہیں تو تجھے تین طلاق۔ وہ کہنے لگی کہ میں تو پریشان ہو رہی ہوں اس لئے کہ اس نے چاند سے زیادہ جو حسین ہونے کی شرط لگائی ہے۔ میں تو اصل میں چراغ سے بھی زیادہ حسین نہیں ہوں۔ مجھ پر تو طلاق ہوگئی۔ لیکن آپ نے اس کی تسلی فرمائی اور فرمایا کہ تم جا کر آرام سے اپنے شوہر کے پاس وقت گزارو اور میں تمہیں لکھ دیتا ہوں کہ تم کو طلاق واقع نہیں

ہوئی۔ اس لئے کہ قرآن کریم میں خود حق تعالیٰ نے قسم اٹھا کر یہ بات کہی ہے کہ ہم نے انسان کو سب سے زیادہ حسین مخلوق پیدا کیا ہے۔ فرمایا کہ۔

والتین والزیتون وطور سینین وھذا البلد الامین. لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم.

سب سے بہترین مخلوق اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔

اگر ہم اور آپ قرآنی آیت کے اعتبار سے سب سے حسین مخلوق ہیں تو آپ ایمانداری سے بتایئے۔ آج اگر ہم اور آپ اپنا زیادہ تر وقت صورتوں کے بنانے میں لگا دیتے ہیں۔ اپنی صورتوں کے سنوارنے میں لگاتے ہیں۔ تو یاد رکھئے کہ سوائے اس کے کہ اپنے وقت کو کھونا اور ضائع کرنا ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اور پھر بات یہ ہے کہ چاہے جسم کی آپ کتنی ہی خدمت کریں یہ جسم تو فانی ہے۔ آپ اپنے چہرے کو خواہ کتنا بھی حسین بنالیں۔ یہ حسن تو ختم ہوتا ہے۔ کسی عارف نے بڑی اچھی بات کہی اس نے کہا کہ

حسن کا کیا پوچھنا ہے حسن کی کیا بات ہے
حسن وہ جادو ہے، جادو جس کے آگے مات ہے

بے شک حسن کے اندر بڑا جادو ہے۔

حسن ماہ چار سے ہے لیکن اتنا اور کہے

ماہ چار سے چودھویں کا چاند مراد ہے۔

حسن ماہ چار سے ہے لیکن اتنا اور ہے
چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات ہے

یہ سارے کا سارا حسن جو ہم اور آپ بنا رہے ہیں۔ یہ تمام بناوٹی ہے۔ یاد رکھئے یہ حسن ایک نہ ایک دن ختم ہو جائے گا۔ یہ حسن باقی رہنے والا نہیں۔ اگر ہم اپنا وقت سیرتوں کے بنانے میں لگائیں۔ اخلاق کے سنوارنے میں لگائیں تو سیرت میں تو یہ بات ہے کہ آپ بنا سکتے ہیں۔ اگر سیرت خراب ہے۔ تو سیرت اچھی ہو سکتی ہے۔ اور انسان اصل میں نام صورت اور جسم کا نہیں۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ہمیں آپ کسی انسان سے ملاقات کرائیں۔ آپ ان کو لے جا کے کسی

ایسے شخص کے سامنے کھڑا کردیں جسے نہ بات کرنے کی تمیز ہو نہ اس کو ملنے کا ڈھنگ آتا ہو۔ظاہر ہے ملاقات کرنے والا یہ کہے گا ارے میاں یہ تو آپ نے انسان سے نہیں کسی جانور سے آپ نے ملا دیا۔

کیونکہ انسان صورتوں کا نام نہیں۔ انسانی جسم کا نام نہیں۔ مولانا جلال الدین رومی کا فیصلہ بالکل صحیح فیصلہ ہے۔فرمایا کہ ؎

گر بصورت آدمی انسان بدی　　　احمد وبوجہل ہم یکساں بدی

اگر صورتوں ہی کا نام انسان ہوتا تو پھر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک میں آپؐ کے اعضاء میں اور ایک ابوجہل اور ابولہب کے اعضاء میں کیا فرق ہے۔(بظاہر) کوئی فرق نہیں ہے۔لیکن اس کے باوجود آپ دیکھئے حضرت بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حبش کے رہنے والے ہیں۔ رنگ بالکل سیاہ نہ آپ کے علاقے کے رہنے والے نہ آپ جیسا رنگ۔ نہ آپ جیسی صورت، لیکن آپ دیکھئے ابوجہل اور ابولہب جو آپ کے اپنے قبیلے کے رہنے والے ہیں۔ چہرہ بھی ان کا اچھا ہے۔ رنگ بھی ان کا اچھا ہے۔لیکن اس کے باوجود آپؐ نے ابوجہل اور ابولہب کو ٹھکرا دیا اور بلال حبشی کو آپؐ نے سینے سے لگایا۔

اور صرف سینے ہی سے نہیں لگایا بلکہ یہ لکھا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ اے بلال! تمہارا کونسا عمل اللہ کو اتنا پسند آ گیا اتنا پسند آ گیا کہ میں نے شب معراج میں دیکھا کہ تم مجھ سے آگے آگے جا رہے ہیں۔

آپ اندازہ لگایئے اگر صورتوں ہی کا نام انسان ہوتا تو حضرت بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ مقام کس (چیز) نے عطا فرمایا۔ حضرت بلالؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ دو عمل میری طرف سے ہوتے ہیں ایک تو میں **قل ھو اللہ احد** کثرت سے پڑھا کرتا ہوں اور دوسرا یہ کہ میں اپنے آپ کو سب سے زیادہ حقیر اور سب سے زیادہ کمتر سمجھتا ہوں۔

کسی نے سچ کہا۔فرمایا کہ ؎

ساری دنیا کی نگاہوں سے گرا ہے مجذوب
تب کہیں جا کے تیرے تیرے دل میں جگہ پائی ہے

ایک انسان اپنے آپ کو اپنی نظروں سے گرا دیتا ہے۔ یاد رکھئے اللہ تعالیٰ کی نظروں میں اس کا مرتبہ بڑھ جاتا ہے۔

آپ دیکھئے کس طریقے پر ہم اور آپ اپنی صورتوں کی خدمت کر رہے ہیں اور اپنے جسموں کو سنوار رہے ہیں۔ لیکن درحقیقت انسان جس چیز کا نام ہے اس کی طرف کوئی التفات اور توجہ نہیں دیتا۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دین اور یہ مذہب جس میں ہم اور آپ موجود ہیں یہ ایسا مذہب ہے۔ شاید دنیا کے دوسرے مذاہب ادھورے ہیں۔ لیکن اسلام ایسا کامل ترین مذہب ہے کہ ہر چیز کا علاج بھی مل سکتا ہے۔ ہر چیز کی رہنمائی بھی آپ کو مل سکتی ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے کہ جہاں پر اسلام کی تعلیمات موجود نہ ہوں۔

عیسائیت کو آپ لیجئے عیسائیت میں دیکھئے بہت سے احکام ہیں۔ نکاح کے احکام بھی موجود ہیں لیکن آپ اگر عیسائیت میں طلاق کا وجود دیکھیں تو طلاق کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ان کے ہاں جب ضرورت محسوس کی گئی کہ اب یہ ہونا چاہئے کہ میاں بیوی کے درمیان اتفاق نہ ہو۔ ان میں نباہ کی کوئی صورت نہ ہو۔ تو کوئی نہ کوئی شکل ایسی ضرور ہونی چاہئے کہ جس سے دونوں میں علیحدگی کرائی جائے۔ انہوں نے ضرورت محسوس کی تو وہ گرجا میں گئے۔ گرجے والوں نے یہ کہا یہ اختیار ہم نے کورٹ کے جج کو دیا ہے۔ جج کو یہ اختیار ہے کہ وہ ان کے درمیان علیحدگی کرائے۔

اب ان سے ذرا یہ تو کوئی پوچھے کہ بھئی آپ کا نکاح تو ہوا ہے۔ چرچ میں اور گرجے میں۔ لیکن طلاق کا اختیار جو آپ کورٹ کو دے رہے ہیں اس کی وجہ کیا ہے۔ تو وہ جو پادری ہے وہ یہ کہتا ہے کہ بھئی دیکھو ہم نے تمہارا نکاح تو کیا تھا اس طریقے پر کہ ایک گرہ تو ہم نے زمین پر باندھ دی تھی اور اگر گرہ ہم نے آسمان پر لگا دی۔ تو بھئی زمین کا گرہ تو ہم کھول سکتے ہیں۔ آسمان کا گرہ ہم سے نہیں کھل سکتی۔

پادری کہتا ہے کہ نکاح تو ہو سکتا ہے لیکن طلاق کی کوئی شکل نہیں آپ اندازہ کریں کہ کورٹ کا جج یہ آسمان کی گرہ کیسے کھولے۔

آپ اگر غور کریں اور سوچیں۔ اسلام ایسا مذہب ہے کہ ہر شعبہ کے اندر آپ کو تعلیمات دے رہا ہے۔ اسلام کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جو انسان کی زندگی سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ لیکن یہ بدقسمتی ہے کہ آج اتنی بڑی نعمت اللہ تعالیٰ نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل اور صدقہ میں عطا فرمائی ہے۔ لیکن ہم نے اس کی ناقدری اس طریقے سے کی ہے آج ہم میں سے بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اسلام سے منہ پھیرتے ہے۔ اعراض کرتے ہیں اور کسی اور سے یہ کہتے ہیں کہ آپ اپنا کوئی تعلیم کا نظام ہمیں بتلایئے اس لئے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں تعلیم کا تصور نہیں کسی سے اقتصادیات کی بھیک مانگی جاتی ہے۔ کسی سے معاشیات کی بھیک مانگی جاتی ہے اور کسی نہ کسی طریقے سے دوسرے مذاہب سے مدد لے رہے ہیں۔ لیکن بات اصل میں یہ ہے۔ یہ قسمت کی بات ہے کہ کون فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اور کون نقصان اٹھاتا ہے۔ فرمایا کہ

؎ پروانہ جلا تو خاک ہوئی اور شمع جلی تو نور ہوا

آپ دیکھئے آگ اگر جل رہی ہو تو اس سے آپ آگ لے کر قریب لے جائیں تو اس سے دوسرا دیا جل جائے گا۔ روشنی بڑھ جائے گی۔ لیکن یہ آگ اگر کسی پروانے کے لگ جائے تو پروانے سے روشنی نہیں ہوتی۔

پروانہ جل کے خاک ہو جاتا ہے۔ فرمایا کہ ؎

اس بزم گہہ دنیا میں نظر یہ اپنی اپنی قسمت ہے
پروانہ جلا تو خاک ہوئی اور شمع جلی تو نور ہوا

آج اسلام ایسا مذہب ہمارے پاس ہے۔ لیکن یہ ہماری قسمت ہے۔ ہماری یہ محرومی ہے کہ اسلام سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے اور دوسرے مذاہب کی طرف ہماری نظر اٹھتی ہے۔

حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ مسلم قوم کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک فقیر ایک محلے میں ہر دروازے پر دستک دیتا ہے۔ دروازہ کھٹکھٹا کے یہ کہتا ہے کہ مجھے روٹی کی ضرورت ہے۔ بھوک لگی ہے۔ لیکن حالت اس کی یہ ہے کہ سر کے اوپر اس نے جو ٹوکرا رکھا ہے۔ وہ ٹوکرا پورے کا پورا روٹیوں سے بھرا ہوا ہے۔ فرمایا ؎

یک سید پر نان ترا بر فرق سر　　　تو ہمیں جوئی لب نان در بہ در

ارے ظالم یہ جوتو ہر دروازے پر جا کے روٹی مانگ رہا ہے۔ ذرا اپنے سر پر ٹوکرے کو کھول کے دیکھ۔ روٹیوں سے بھرا ہوا ہے۔ دوسرے کے دروازے پر جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اسلام نے ہر شعبہ کے اندر ہمیں احکامات دیئے ہیں۔ ہمارے اخلاق کو سنوارا ہے۔ ہماری ہر ضرورت کو پورا کیا ہے۔ جو آج ہم اور آپ دیکھتے ہیں سب سے زیادہ ضرورت کس بات کی ہے۔ آج تو اصل میں ہماری مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی بیمار ہوتا ہے اس کے جسم کے اوپر پھوڑے اور پھنسیاں ہوتی ہیں اس کے خارش ہو رہی ہے۔ اگر اس سے کوئی جا کے پوچھے کہ بھئی دنیا میں سب سے زیادہ لذیذ چیز آپ کو کونسی لگتی ہے۔ یہ بات میں اس لئے عرض کر رہا ہوں۔ بعضے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ارے صاحب آپ نے تو گناہ کا مزہ ہی نہیں چکھا ہے۔ اس لئے تو آپ ہمیں گناہوں سے منع کرتے ہیں۔

اور یہ حقیقت ہے۔ برائی کے اندر، شیطانی حرکتوں کے اندر جتنی لذت ملتی ہے اور یہ بھی آپ ہی کے خیال میں ہے۔ ورنہ اگر کسی اللہ والے سے آپ پوچھیں کہ سب سے زیادہ لذیذ چیز کونسی ہے۔ وہ یہ کہے گا کہ اگر محبوب کے ساتھ ہمارے قدم مل جائیں یا محبوب کے قدموں کے اندر ہماری جان نکل جائے تو وہ یہ کہتا ہے کہ سب سے زیادہ لذیذ چیز یہی ہے۔

لیکن ہم اور آپ کیا کہتے ہیں۔ صاحب آپ نے گناہ کا تو مزہ نہیں چکھا۔ لیکن ایمانداری سے بتایئے گناہ میں بے شک لذت ہے۔ لیکن اس لذت کے اوپر غور کیجئے کہ یہ لذت اچھی لذت ہے یا بری لذت ہے۔

میں نے ابھی مثال دی کہ جسم کے اوپر پھوڑے پھنسیاں ہو جائیں۔ اور اس مریض سے جا کے پوچھا جائے کہ سب سے زیادہ آپ کو کونسی چیز اچھی لگتی ہے تو وہ کیا کہے گا۔ کسی نے از راہ مذاق یہ بات کہی ہے کہ ؎

لڈو میں نہ پیڑے میں نہ برفی میں مزہ ہے

بعض چیزیں ایسی ہیں کہ ہر شخص پسند کرتا ہے۔

لڈو میں نہ پیڑے میں نہ برفی میں مزہ ہے
جو حضرت کھجلی کے کھجانے میں مزہ ہے

وہ کہے گا کہ ساری دنیا کی نعمتیں ایک طرف لیکن جو چیز میرے بدن کے اوپر ہو رہی ہے۔اس میں تو کھجانے ہی میں ساری لذت ہے اور کسی چیز میں نہیں۔

کھجانے میں لذت تو ہے لیکن معاف کیجئے یہ لذت بیماری کی لذت ہے۔اگر آپ کا ذوق اچھا ہو۔صحیح ذوق آپ کے پاس ہو تو یاد رکھئے کہ گناہوں میں تو لذت آپ کو مل رہی ہے۔یہ درحقیقت ایسی ہی بیماری کی لذت ہے جیسے پھوڑے پھنسی والوں کو کھجانے میں لذت ملتی ہے۔

لیکن ہم اصل میں یہ کہتے ہیں کہ لذت حاصل کرو اسلام کے مطابق شریعت کے مطابق۔آج بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں کہ جنہیں یہ احساس ہی نہیں ہے کہ ہمارے بدن کے اوپر پھوڑے پھنسیاں ہیں۔وہ یہ سمجھتے ہیں ہم سب سے زیادہ صحت مند اور تندرست ہیں۔لیکن بات یہ ہے کہ بیمار کو اگر یہ پتہ چل جائے کہ میں بیمار ہوں۔تب بھی غنیمت ہے۔اس لئے کہ اگر یہ احساس نہ ہو کہ میں بیمار ہوں تو آپ بتایئے کہ اس کا علاج کیسے کرایا جائے۔علاج تو جب ہی ہو سکتا ہے کہ جب یہ تسلیم کیا جائے کہ یہ واقعی بیمار ہے۔لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ نہیں صاحب! میں تو بڑا صحت مند اور توانا ہوں۔لیکن اگر دیکھنے والے یہ کہیں کہ ارے ظالم میں دیکھ رہا ہوں کہ تجھے بیماریاں لگی ہوئی ہیں۔جس کا مطلب یہ ہے۔بیمار تو بے شک وہ ہے لیکن احساس اس سے ختم ہو چکا ہے۔اس بیماری کا احساس اس کو نہیں۔ایسے بھی بہت سے لوگ ہیں۔علامہ اقبال کا شعر ہے ؎

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

ارے میاں قافلے تو لٹتے ہی ہیں لیکن اگر قافلے والوں کو لٹنے کا علم ہو جائے۔یہ بھی غنیمت ہے۔لیکن اگر قافلہ لٹ جائے اور قافلے والوں میں یہ خبر ہی نہ ہو کہ ہمارا قافلہ لٹا بھی ہے یا نہیں۔فرمایا کہ اس سے زیادہ بدقسمتی اور محرومی اور کیا ہو سکتی ہے کہ انسان کا احساس ہی مردہ ہو جائے۔اس کا ضمیر ہی مردہ ہو جائے۔

آج ہم اور آپ سب کے سب اس مریض کی طرح پر ہیں کہ جس کے جسم کے اندر جس کے جسم کے اوپر پھوڑے پھنسیاں ہیں۔ لیکن ہمیں اور آپ کو اصل میں احساس ہونا چاہئے کہ واقعی ہم بیمار ہیں۔ ہمارے اندر روحانی طور پر بہت سے امراض لگے ہوئے ہیں اور اس کا ایک ہی علاج ہے۔ کہ آپ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا مطالعہ کریں۔ آپ کی تعلیمات کو سنیں اور سننے کے بعد کوشش کریں کہ جو امراض آپ کے اندر ہیں ان امراض کا علاج کریں۔

دین اسلام درحقیقت صرف پوجا پاٹ کا دین نہیں ہے۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ ارے صاحب تم نے دین اسلام کو تو بالکل ہوا بنا رکھا ہے۔ نماز، روزہ، حج اور زکوۃ یہی دین اسلام ہے۔ نہیں۔ جو لوگ اسلام کو یہ سمجھتے ہیں کہ صرف عبادتوں ہی کا نام اسلام ہے۔ وہ غلطی پر ہیں اسلام صرف عبادتوں کا نام نہیں۔ اسلام درحقیقت اخلاق بھی سکھاتا ہے۔ اسلام آپ کو معاملات کے اندر بھی تعلیم دیتا ہے اور فرمایا کہ اسلام سب سے زیادہ اگر کسی چیز پر زور دیتا ہے وہ ہمارے اخلاق کے درست کرنے پر زور دیتا ہے کہ انسانوں کے اخلاق سب سے زیادہ بہتر ہو جائیں۔ تو فرمایا کہ وہ شخص سب سے زیادہ بہتر ہے۔ (جس کے اخلاق اچھے ہوں)

اور اخلاق میں نے ابھی عرض کیا۔ انسانی سیرت و کردار کا نام ہے۔

کچھ لوگ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہؐ ایک عورت ہے۔ وہ نمازیں بھی زیادہ پڑھتی ہیں روزے بھی رکھتی ہیں۔ قرآن کریم کی تلاوت بھی کرتی ہے۔ لیکن یارسول اللہؐ وہ عورت اخلاق کی اچھی نہیں ہے۔ اس کی زبان اچھی نہیں ہے۔ جب کسی سے بات کرتی ہے اس کا دل توڑ دیتی ہے۔ ہر ایک کی دل شکنی کر رہی ہے۔

اور ایک دوسری عورت ہے عبادتیں تو بے شک واجبی واجبی کرتی ہے لیکن یارسول اللہ ہم نے دیکھا ہے۔ اس کے اخلاق بڑے اعلیٰ ہیں۔ اس کی سیرت بہت اعلیٰ ہے۔ اس کی زبان میں اتنی حلاوت ہے کہ جب بھی کسی سے بات کرتی ہے۔ ہر شخص اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ اس کا شوہر بھی اس سے راضی ہے۔ اس کے بھائی بہن سب رشتہ دار اس سے راضی ہیں۔

یارسول اللہؐ ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ ان کا انجام آخرت میں کیا ہوگا سرکار دو عالم صلی

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ عورت جو عبادتیں تو بے انتہا کرتی ہیں لیکن اگر اس کے اخلاق بہترین نہیں ہے۔ اس کا کردار اچھا نہیں ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ وہ عورت اپنی بداخلاقی کی وجہ سے جہنم میں جائے گی۔

اور جو عورت عبادت تو بے شک واجبی واجبی کرتی ہے۔ کوئی زیادہ عبادتیں نہیں کرتی ہے۔ لیکن اس کا اخلاق اچھا ہے اس کے کردار اچھا۔ فرمایا کہ یہ اپنی خوش اخلاقی کی وجہ سے اپنے بہترین کردار کی وجہ سے یہ عورت جنت میں جائے گی۔

یہاں ذرا ایک شبہ ہوتا ہے۔ بعضے لوگ اصل میں ظاہری الفاظ سے کچھ اور معنی لیتے ہیں۔ اگر یہ بات کہی جارہی ہے کہ اسلام میں اخلاق کا سب سے بڑا دخل ہے۔ تو بعضے لوگ کہتے ہیں کہ اچھا صاحب۔ آپ ہمیں مہلت دے دیں ہم اپنا اخلاق بہترین بنا کے آپ کے سامنے لے آئیں گے۔ اپنی سیرت اور کردار کے لئے مختلف لوگوں سے اصلاح لے کے ہم آپ کے سامنے لاکر دے دیں گے۔ پھر آپ بشارت دیں گے ہمیں جنت کی۔

لیکن یاد رکھئے کہ اخلاق اور کردار آپ کا بہترین ہونا چاہئے۔ کس صورت میں، فرائض کے بعد۔ اگر اخلاق آپ نے بہترین بنا دیئے۔ سیرت و کردار آپ نے اچھا کرلیا تو یہ نہ سمجھئے کہ آپ بے نیاز ہوگئے۔ نماز روزے کی طرف سے۔ اب آپ کو کوئی ضرورت نہیں زکوٰۃ اور حج کی۔

یاد رکھئے کہ یہ ساری کی ساری عبادتیں جو ہیں یہ فرائض کے اندر داخل ہیں۔ ان کو تو بہرحال پورا کرنا ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ اسلام میں سب سے زیادہ اہمیت اخلاق اور کردار کی ہے۔

ایک مقدمہ آیا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عدالت میں۔ آپ نے مدعی سے فرمایا کہ اچھا تم دو گواہ لے کے آؤ۔ آج کل تو ایسا ہوتا ہے کہ کسی شخص کو پھرتے پھرتے پکڑ کے لے آتے ہیں۔ آپ اس کو ایک رقم دے دیں وہ آپ کے حق میں گواہی دے دیں گے۔ لیکن اسلام کیا کہتا ہے۔ تو فرمایا کہ وہ شخص دو گواہ لے کے آیا۔ ایک سے آپ (حضرت عمرؓ) واقف تھے۔ دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے سوال کیا کہ بھئی تم یہ بتاؤ جو شخص تمہیں اپنی گواہی کے لئے پیش کررہا ہے۔ کبھی اس کے ساتھ ایسا موقع بھی آیا کہ تم نے اس کو کوئی قرض دیا ہو یا اس سے قرض لیا ہو۔ اور یہ بڑا اہم سوال ہے اس لئے

کہ قرض ایسی چیز ہے کہ انسانوں کے تعلقات کبھی کبھی ختم ہو جاتے ہیں۔ کسی نے سچ کہا کہ۔

ان القرض مقراض المحبة

قرض اصل میں محبت کی قینچی ہوتا ہے۔ دو دوستوں میں آپس میں محبت ہے۔ ایک نے دوسرے سے قرض لے لیا۔ وقت پر ادا نہیں کیا۔ اب دیکھئے ان دونوں کی دوستی اور محبت جو ہے ایک قرض کی وجہ سے ختم ہو جاتی ہے۔

اس نے کہا کہ یا امیر المؤمنین! میں نے نہ تو کبھی اس شخص کو قرض دیا نہ اس سے کبھی قرض لیا۔ ایسا میرا کوئی معاملہ اس کے ساتھ پیش نہیں آیا۔

آپؓ نے فرمایا کہ اچھا دوسرا سوال میرا یہ ہے کہ کبھی تم دونوں نے آپس میں مل کے سفر کیا ہے۔ اس لئے کہ سفر بھی ایسی چیز ہے۔ سفر کے معنی آتے ہیں پردہ اٹھانا، پردہ کھولنا۔ دو دوست جب آپس میں سفر کرتے ہیں تو حالت سفر سے معلوم ہو جاتا کہ اس کے کیا عادات ہیں۔ اس کی کیا ذہنیت ہے۔ اس کا کیا کردار ہے سب کھل کے سامنے آجاتا ہے۔

اس نے کہا اے امیر المؤمنین! میں نے اس کے ساتھ زندگی میں کبھی سفر بھی نہیں کیا۔

آپؓ نے فرمایا کہ اچھا تیسرا سوال یہ ہے کہ کہیں اس کے پڑوس میں رہنے کو تمہیں موقع ملا۔ اس لئے کہ پڑوس میں رہنا۔ میں کراچی سے آیا ہوں کسی کو کیا معلوم کہ میری کیا عادتیں ہیں۔ میری کیا خصلتیں ہیں۔

اگر ایک شخص پڑوس میں رہتا ہو تو اس کے سارے حالات کا علم ہو جاتا ہے کہ کیا اس کے معاملات ہیں کیا اس کی عادتیں ہیں۔ کیا اس کے اندر برائی ہے کیا اس کے اندر خوبی ہے۔

مثال کے طور پر اگر ایک پڑوسی نے دوسرے کے دروازے پر سڑی ہوئی دال گھر میں سے اٹھائی، جا کر ڈال دی۔ پڑوسی اندازہ کرلے گا۔ کہ یہ جو میرے پڑوس میں رہ رہا ہے یہ اصل میں تعلقات قائم کرنے کے قابل نہیں ہے یہ اتنا بد اخلاق ہے کہ اپنی سڑی ہوئی چیزیں میرے دروازے پہ ڈال رہا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سوال کے جواب میں اس شخص نے کہا کہ ایسا موقع بھی کبھی پیش نہیں آیا۔

آپ دیکھئے حضرت عمر فاروق ؓ ایک مقدمے کا فیصلہ فرما رہے ہیں لیکن یہ نہیں پوچھ رہے ہیں کہ تمہاری تسبیح میں دانے کتنے ہیں۔ تم کتنے نوافل پڑھتے ہو۔ تمہاری تلاوت قرآن کتنی ہے۔

آپؓ نے فرمایا کہ جس شخص کو تو گواہ بنا کے لایا تھا ارے میاں تم تو یہ کہتے تھے کہ یہ بڑا دیندار ہے۔ دینداری کی جو علامتیں تھیں وہ تو میں نے پوچھ لیں، اس کے اندر تو کوئی علامت نہیں پائی جاتی معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ کسی مسجد سے نکل رہا ہو گا تم دیندار سمجھ کے اس کو گواہی میں لائے ہو۔

آپ دیکھئے اسلام درحقیقت ہمارے اور آپ کے کردار کو سنوارنا چاہتا ہے۔ آپ کو معاملات کی تعلیم دے رہا ہے۔ لیکن اگر صرف عبادتوں کو اسلام سمجھ لیا جائے تو یہ آپ کی غلط فہمی ہو گی۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے اور فرمایا کہ۔ **انما بعثت لا تمم مکارم الاخلاق۔**

میں دنیا میں بھیجا گیا ہوں اس لئے کہ تمہارے اخلاق کو میں سنواروں۔ تمہارے اندر کردار پیدا کروں۔ تمہاری سیرت کو اچھا بناؤں۔ آپ دیکھئے سیرت اور اخلاق یہ اتنا بڑا اثمرہ ہے کہ اگر آپ سارے پھولوں کو سمیٹنا چاہیں تو شاید سمیٹ نہیں سکیں گے۔

کسی نے اپنی محرومی کا گلہ کیا ہے۔ اس نے کہا کہ

داماں نگہ تنگ و گل حسن و بسیار گلچین بہار تو زداماں گلہ دارد

چمن کے اندر پھول تو بہت ہیں لیکن یہ بدقسمتی ہے کہ میرا دامن چھوٹا ہے۔

آج اخلاق میں سے ایک اخلاق ایسا ہے جس کی ضرورت زیادہ ہے یہ مطلب نہیں ہے کہ جتنی اور اخلاقیات کی باتیں ہیں اور جتنے آپؐ کے ارشادات ہیں وہ سب کے سب نعوذ باللہ کوئی غیر مذہبی ہیں نہیں۔ سب سے زیادہ ضرورت آج کے مسلمانوں کو جس ارشاد کی ہے۔

قال! قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم.

یہ تو آپؐ کا ارشاد ہے۔ آپ ذرا قرآن کریم پڑھئے، کیا بیان فرمایا۔

ان الذین یؤذون اللہ ورسولہ لعنھم اللہ فی الدنیا والاخرۃ (۵۷:۳۳)

وہ لوگ کہ جو اللہ کو ایذا اور تکلیف پہنچاتے ہیں۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان پر لعنت بھیجتا ہے دنیا میں بھی آخرت میں بھی۔ بھلا اللہ کو تکلیف کیسے ہو سکتی ہے اللہ کے تو کوئی جسم نہیں اللہ کے تو کوئی قالب نہیں۔ اللہ کے دل نہیں فرمایا۔

مابری از پاک و ناپاکی ہمہ وزگراں جانی و چالاکی ہمہ

اللہ تعالیٰ جسم اور بدن سے بالکل پاک ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو ایذا اور تکلیف کب پہنچتی ہے۔ فرمایا کہ الخلق عیال اللہ یہ خلق خدا یہ مخلوق جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ درحقیقت ایسے ہیں جیسے اللہ کی اولاد۔ یہ مخلوق اللہ کی نظر میں ایسی ہے جیسے باپ کی نظر میں اولاد ہوتی ہے۔

اگر باپ کے سامنے اولاد کو کوئی ترچھی نگاہوں سے دیکھتا ہے تو آپ ایمانداری سے بتایئے کہ آپ کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ کوئی باپ یہ بات برداشت نہیں کرتا کہ میری اولاد کو کوئی ٹیڑھی نگاہ سے دیکھے یا میری اولاد کو کوئی تکلیف پہنچائے۔

تو آپ بتایئے جب ساری مخلوق کی مثال، ساری مخلوق کی اذیت اللہ کی نظر میں ایسی ہے جیسے باپ کی نظر میں اولاد ہوتی ہے جس طریقے پر باپ کا دل رنجیدہ ہو جاتا ہے اولاد کو تکلیف پہنچانے سے اگر خلق خدا کو کوئی تکلیف پہنچائے گا تو یاد رکھئے اس نے خلق خدا کو نہیں بلکہ اللہ کو تکلیف پہنچائی فرمایا کہ۔

ان الذین یؤذون اللہ ورسولہ لعنھم اللہ فی الدنیا والاخرۃ (۵۷:۳۳)

کسی نے سچ کہا۔ فرمایا ؎

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بلوں میں پھرتے ہیں مارے مارے

میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

اللہ کے بندوں سے اگر حسن سلوک کرو گے اللہ کی نظر میں تمہاری عزت بنے گی۔ تمہارا وقار پیدا ہو جائے گا اور اگر خلق خدا کو تکلیف پہنچائی تو یاد رکھئے وہ تکلیف اللہ کو ہوگی اور اس کے رسول کو آگے فرمایا۔

والذین یؤذون المومنین والمومنت بغیر ما اکتسبوا فقد احتملوا بھتاناً واثما مبینا. (۵۸:۳۳)

اور جولوگ مؤمنین کو اور مؤمنات کو تکلیف پہنچاتے ہیں ایذا پہنچاتے ہیں اور یہ جو فرمایا بغیر ما اکتسبوا یعنی بغیر کسی وجہ کے بغیر کسی سبب کے جولوگ مؤمنین کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ فرمایا کہ انہوں نے ایک بہت بڑا وبال اپنے سر پر اٹھایا ہے۔

آپ دیکھئے میرے دوستو اور بزرگو! قرآن کریم ہمیں خلق خدا کو ایذا اور تکلیف پہنچانے سے منع کر رہا ہے اور مؤمنین اور مؤمنات کو تکلیف پہنچانا بھی قرآن کریم کی نظر میں پسندیدہ نہیں ہے۔ یہ تو قرآن کریم کی آیت تھی حدیث کو سنئے فرمایا۔

المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده (الحدیث)

بہترین درجے کا مسلمان وہ ہے۔ المسلم کا ترجمہ ہے بہترین اور کامل درجے کا مسلمان۔ بہترین اور کامل درجے کے معنی تو یہ ہوئے کہ ادنیٰ درجہ کے بھی ہوں گے ظاہر ہے کہ ایک چیز اگر کامل ہے تو کامل کے مقابلے میں ناقص بھی ہوگی۔

ناقص مسلمان کون۔ علامہ اقبال کا شعر ہے۔ فرمایا

زبان سے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل ‏ ‏ ‏ دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

صرف زبان سے کلمہ پڑھ لینا کافی نہیں ہے۔ جب تک آپ اظہار نہ کریں اپنے عادات اور پنے اطوار سے اپنے اعضاء سے۔ یاد رکھئے کہ ہمیں حق نہیں ہے کہ اپنے آپ کو کامل درجے کا مسلمان کہیں۔

فرمایا کہ بہترین درجے کا مسلمان کون؟ کہ جس کے ہاتھ سے اور زبان سے مسلمان اور دوسرے لوگ محفوظ رہ سکیں۔ آپ دیکھئے وہ قرآن کریم کا حکم، یہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم۔ اب آپ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی زندگی اٹھا کر دیکھئے۔

میرے دوستو! اور بزرگو جب تک ہم اور آپ کسی نمونے کو اپنے سامنے رکھ کر نہ دیکھیں۔ ہمارے اندر کبھی کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوسکتا۔ اور دنیا کے سارے مفکر ایک طرف چاہے وہ کسی قسم کے کیسے ہی نمونے آپ کے سامنے پیش کریں۔ اس لئے کہ بعضے لوگ کہتے ہیں ارے صاحب! یہ نمونہ جو آج پیش کر رہے ہیں یہ درحقیقت چودہ سو سال پرانا نمونہ ہو گیا ہے چودہ سو سال میں کافی حالات بدل گئے ہیں۔ آج آپ نیا نمونہ لے کے آئیں یہ تو آپ نے بڑی

بات کہہ دی۔ لیکن ہم آپ سے سوال کرتے ہیں، اگر کسی کلاس کے اندر ٹیچر نے بلیک بورڈ کے اوپر کوئی صراحی کی تصویر بنائی اور اس نے طلباء سے یہ کہا کہ اپنے اپنے پرچے کے اوپر کاغذ کے اوپر بعینہ ایسی ہی تصویر بنائیں تو بہت سے طلباء نے بنائی لیکن ایک صاحب جو ایک بڑے مفکر بھی تھے۔ انہوں نے صراحی کی شکل بنانے کی بجائے صراحی کی تعریفیں لکھنی شروع کی کہ صراحی کا یہ فائدہ ہے یہ فلاں چیز سے بنتی ہے یہ اس طریقے پر اس کی شکل وصورت بنتی ہے۔ یہ سارے کے سارے اوصاف صراحی کے اس نے لکھ دیئے۔ استاد نے سب کی تصویریں دیکھیں ان کا مقالہ بھی دیکھا۔ استاد نے یہ کہا کہ میں نے بعینہ ایسی ہی صراحی بنانے کو کہا تھا۔ میں نے تعریف کرنے اور اوصاف کرنے کو نہیں کہا تھا۔ استاد Reject کر دے گا۔

اگر آپ صرف سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریفیں کرتے رہے اور آپؐ کے صرف محاسن بیان کرتے رہے آپؐ ان کی خوبیاں بیان کرتے رہیں۔ لیکن یاد رکھئے میرے دوستو! کہ جس طریقے پر صراحی کی تعریفیں کافی نہیں تھی اسی طریقے پر یہ تعریفیں اور محاسن بیان کرنا کافی نہیں ہے۔ جب تک کہ ہم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کو اپنا نمونہ نہ بنائیں۔

اور اگر کوئی کہتا ہے کہ صاحب! چودہ سو سال پرانا اس پر میرے والد صاحب (مولانا احتشام الحق صاحب تھانویؒ) نے ایک مثال دی تھی۔ فرمایا کہ آپ ایک بڑا بہترین قسم کا کپڑا لے کے آئے اور درزی کے پاس لے جائیں اور اچکن کا اپنا ایک نمونہ رکھوا کر درزی سے کہیں اور تاکید کر دیں کہ میں جو نمونے کے طور پر اچکن لے کے آیا ہوں بعینہ ایسا ہی اچکن سی لینا۔ لیکن وہ درزی بھی دراصل ہمارے ہی جیسا ذہن رکھتا تھا۔ اس نے یہ کہا کہ یہ میاں جو اچکن لے کے آیا ہے یہ تو پتہ نہیں کتنا پرانا فیشن ہے اس کو تو معلوم ہی نہیں یہ تو بدذوق آدمی ہے۔ اس نے کہا کہ آج کا جو فیشن ہے میں اس کے مطابق اچکن بناؤں گا۔ انہوں نے جدید فیشن پر اچکن بنا دی۔ مالک جب لینے کے لئے آئے اور اس نے دیکھا کہ میری مرضی کے مطابق اور نمونے کے مطابق نہیں بنائی۔ اس نے وہ اچکن لے کے اس کے منہ پر مار دی۔ اور یہ کہا کہ ظالم میں نے تو یہ نمونہ پیش کیا تھا تو نے اپنے ذہن سے ایسا نمونہ کیوں بنا دیا۔

ہم اور آپ اپنے ذہن سے اپنی فکر سے اور اپنے سوچ سے اول تو کر کچھ نہیں سکتے۔ لیکن

اگر کوئی کرے تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہترین نمونہ کوئی پیش نہیں کر سکتا۔

یاد رکھئے۔ جب قیامت میں ہم یہ نمونہ لے کے جائیں گے جو شریعت کے مطابق نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس طریقے سے منہ پر مار دیں گے اور فرمائیں گے کہ ہم نے جو نمونہ تمہیں پیش کیا تھا تم نے اس کے مطابق کیوں نہیں بنایا۔

ہم اور آپ کس طریقے پر اپنے آپ کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو اپنائیں اور غور کریں کہ عمل کیسے ہو۔ آپؐ کا نمونہ کیسا ہے۔

حدیث میں آتا ہے آپؐ کی والدہ فرماتی ہیں کہ جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم میرے شکم میں تشریف رکھتے تھے۔ اتنی تکلیف مجھے کبھی نہیں ہوئی جتنی اور خواتین کو عام طور پر ہوا کرتی ہیں۔

وجہ کیا ہے رحمۃ للعالمین سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لانے والے ہیں۔ آپ نے کئی غزوات میں بنفس نفیس شرکت فرمائی۔ لیکن یہ لکھا ہے کہ آپ کی تلوار سے کبھی کوئی کافر بھی ہلاک نہیں ہوا۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اتنے غزوات میں شرکت فرمائی لیکن آپؐ کے ہاتھ سے کسی کی جان ختم نہیں ہوئی۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ جو نصب العین آپؐ لے کر آئے ہیں جو مشن آپؐ لے کے آئے ہیں یہ ہے کہ خلق خدا کو راحت اور آرام پہنچایا جائے۔ خلق خدا کو ہر قسم کی تکلیف کو دور کیا جائے۔ تو پھر اس کے ہاتھ سے کب کسی کی جان ختم ہو جائے۔

ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ آپ سفر جہاد میں تھے صحابہؓ بھی آپؐ کے ساتھ تھے۔ ایک مقام پر جا کے آپؐ نے حکم دے دیا کہ یہاں پر ڈیرہ ڈال دیا جائے۔ سامان کھول دیا جائے۔ آپؐ لکڑیاں تلاش کرنے گئے ہیں تھوڑی سی دیر میں آپ آئے اور اتنے گھبرائے ہوئے ہیں صحابہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ کیا پریشانی ہے۔ فرمایا کہ تم جلدی جلدی اپنا اپنا سامان لپیٹو اور جلدی یہاں سے نکلو۔ میں ابھی جو لکڑیاں جمع کرنے کے لئے گیا تھا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اللہ کی مخلوق کے اندر سب سے زیادہ جو نازک مخلوق ہے میں نے چیونٹیوں کو دیکھا ہے کہ چھوٹے چھوٹے بلوں کے اندر رہ رہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا اگر تم یہاں پر رہو گے آگ جلاؤ گے تو ان کو تکلیف ہو گی ان کی جان ختم ہو جائے گی۔ فرمایا کہ

ان کی جان کو ختم کرنا ہمارے مشن کے خلاف ہے آگے تشریف لے گئے۔

جس کا مطلب یہ ہے۔ قرآن کریم بھی کہتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ارشادات میں بھی فرماتے ہیں اور صرف فرماتے نہیں بلکہ عمل کر کے بھی دکھاتے ہیں آج سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مصداق بن جائیں اس حدیث کے کہ فرمایا کہ نہ کسی کو اپنے ہاتھ سے تکلیف پہنچاؤ نہ کسی کو اپنی زبان سے تکلیف پہنچاؤ اور فرمایا کہ یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ اس سے لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہے۔

آپ سوچئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عمر نہ اپنے ہاتھ سے اور نہ کسی کو اپنی زبان سے تکلیف پہنچائی۔ اور زبان سے تکلیف عربی کا شاعر کہتا ہے کہ زخم اگر صرف تلوار سے لگے تو کوئی بات نہیں اس لئے کہ یہ زخم ایک دن ختم ہو جائے گا۔ یہ مندمل ہو جائے گا لیکن اس نے کہا کہ زبان ایسی ظالم چیز ہے کہ اگر اس سے کسی کو زخم لگ جائے تو ساری عمر کے لئے رہ جاتا ہے وہ ختم ہونے والا نہیں۔

جراحات السنان لها التیام ولا یلتام ماجرح اللسان

جو زخم نیزوں اور تیروں سے لگتا ہے وہ زخم ایک نہ ایک دن ختم ہو جاتا ہے لیکن فرمایا کہ جو زخم زبان کے ذریعے سے لگایا جاتا ہے وہ تمام عمر ختم نہیں ہوتا۔ زبان سے تکلیف پہنچانے کی یہ صورتیں ہیں۔

کسی کو گالی دینا۔ کسی کو طعنہ دینا، کسی کے اوپر آوازیں کسنا یا اور اسی طریقے پر کسی کے ساتھ فحش کلامی کرنا۔ حدیث میں آتا ہے۔

لیس المؤمن بالطعان ولا اللعان ولا الفاحش الخ.

مؤمن کی شان یہ نہیں ہے کہ وہ کس کے ساتھ طعنہ زنی کرے وہ کس کے اوپر لعنت بھیجے اور فرمایا کہ مؤمن کی یہ شان بھی نہیں ہے کہ وہ کسی کے ساتھ گالی گلوچ کرے۔

جس کا مطلب یہ ہے زبان سے تکلیف پہنچانے کی بھی کئی صورتیں ہیں ہاتھ سے بھی تکلیف پہنچانے کی کئی صورتیں ہیں لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ یہ بتا رہا ہے کہ آپؐ نے کبھی نہ کسی کو ہاتھ سے تکلیف پہنچائی نہ کسی کو زبان سے۔

لیکن زبان سے تکلیف پہنچانے میں ایک غیبت ہے یہ ایسا جرم ایسی معصیت اور گناہ ہے

اور کئی گناہ ایسے ہیں کہ معاشرے سے اس کا احساس ہی ختم ہو گیا ہے۔ ہمارے معاشرے کے اندر بہت سے گناہ ہو رہے ہیں ہر قسم کے فواحش موجود ہیں۔ لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایسے لوگ بھی آج موجود ہیں کہ گناہوں کے اوپر آہ کرنے والے ہیں اور اگر ساری کی ساری قوم خدانخواستہ گناہ کے اندر لگ جائے اور گناہ کو گناہ سمجھنے والا کوئی نہ ہو تو آپ دیکھئے کہ اللہ کی طرف سے قہر نازل ہوتا ہے۔ اللہ کی طرف سے مختلف صورتوں میں عذاب نازل ہوتا ہے۔ آج اگر آسمان رکا ہوا ہے کس وجہ سے میں ابھی عرض کر رہا تھا۔ ایک اور بات ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری بہت سی بہنیں، ہم ان کے اوپر الزام نہیں لگاتے لیکن بہرحال یہ بے پردگی کی جو نافرمانی ہو رہی ہے اسلام کے حکم کے منافی ہے۔ اسلام کا حکم ہے آپ پردے میں رہیں پردہ آپ کے لئے اللہ تعالیٰ نے تجویز کیا ہے۔ آپ اپنے آپ کو چھپالیں۔

لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ اس پر کوئی خاص عمل نہیں ہے اور آج صرف یہ غیر مذہبی گھرانے کے اندر نہیں بلکہ ہم نے مذہبی گھرانوں کو بھی دیکھا ہے یہ لعنت وہیں بھی پہنچی ہے۔

ایسے حالات کو دیکھ کر دل رنجیدہ ہو جاتا ہے حساس آدمی کے دل کو تکلیف پہنچتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی کوئی بات ایسی بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں خوشی ہوتی ہے۔ ہمارے اندر مسرت کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔

اکبر آلہ آبادی نے کہا تھا کہ ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ اذان کی رسم ختم ہو گئی۔ دل بہت رنجیدہ ہے لیکن ایک مرتبہ بیٹھے ہوئے تھے تو ایک شعر انہوں نے کہا فرمایا کہ

آئی بنگلے میں مرے آج اذان کی آواز

اس سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ اذان ختم ہو چکی تھی

آئی بنگلے میں مرے آج اذان کی آواز

جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے

یہ دیکھ کے ہمیں خوشی ہوتی ہے کہ کچھ لوگ اب بھی ایسے ہیں کہ ان کے دل میں اسلامی احکامات کا احترام موجود ہے۔

مشتاق احمد عفی عنہ

رویت ھلال کمیٹی اوراس کے فیصلوں کی شرعی حیثیت

مولانا احتشام الحق تھانوی چیئرمین مرکزی رویت ہلال کمیٹی

ملک کے مختلف علاقوں سے بڑی تعداد میں ایسے خطوط اور مراسلے موصول ہوئے ہیں جنہیں مرکزی رویت ہلال کمیٹی اور اس کے فیصلوں کی شرعی حیثیت کے بارے میں مختلف سوالات کئے گئے ہیں وہ تمام مراسلے تقریباً ایک ہی نوعیت کے ہیں اس کے لئے ایک عام وضاحتی بیان اخبارات کے ذریعے پیش کیا جارہا ہے۔

مرکزی روئیت ہلال کمیٹی کا پس منظر

حصول پاکستان کے بعد ابتدائی چند سالوں میں سابق وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین نے ایک ہلال کمیٹی کراچی میں بنائی تھی جو شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا بدر عالم میرٹھی، مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا ابن حسن جارچوی اور راقم الحروف پر مشتمل تھی۔ اس کمیٹی کی حیثیت قانونی اور سرکاری نہیں تھی بلکہ نجی طور پر وزیر داخلہ کی سرپرستی اسے حاصل تھی دو تین سال کے بعد یہ کمیٹی شخصی امتیاز اور جماعتی انفرادیت کی نذر ہوگئی اور وحدت باقی نہیں رہی تاہم حکومت پاکستان جامع مسجد جیکب لائن میں ہونے والی رویت ہلال کمیٹی کے فیصلوں کو اہمیت دیتی رہی اور فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں مرحوم کے دور حکومت تک چاند کے مسئلے میں نہ کبھی فرقوں کے مابین کوئی اختلاف رونما نہ ہوا۔ اور نہ حکومت و علماء کے مابین کسی طرح کا اختلاف پیدا ہوا۔ ایوب خاں کے دور حکومت میں جب نوکر شاہی کا پورا تسلط ہو گیا اور عائلی قوانین کے نفاذ پر میرا اختلاف ہو گیا تو بے دین نوکر شاہی نے علماء کے فیصلوں کو نظر انداز کرنے کے لئے چاند کا مسئلہ اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے سابق ڈاکٹر فضل الرحمٰن ہزاروی

اور محکمہ موسمیات کے سپرد کردیا۔ جس کے نتیجے میں حکومت اور علماء کے مابین چاند کے مسئلے میں اختلاف ہوا۔ اور ملک میں بلکہ ہر شہر میں دو دو عیدیں ہوتیں۔

ایوب خان کی حکومت نے دوسرا قدم یہ اٹھایا کہ وزیر داخلہ اے آر خاں کی سرپرستی میں ایک سرکاری ہلال کمیٹی بنائی جس میں ایک مقامی عالم کو بھی شامل کیا گیا جس کے نتیجے میں پھر اختلاف رونما ہوا اور سرکاری ہلال کمیٹی کے فیصلے کو اس بنیاد پر علماء نے قبول کرنے سے انکار کیا کہ وزیر داخلہ چاند کے بارے میں شرعی فیصلے کے طریقے سے ناواقف ہیں اور جب تک ثبوت ہلال کا فیصلہ شرعی بنیادوں پر نہ ہو کسی نجی کمیٹی کا اعلان معتبر ہے اور نہ کسی سرکاری کمیٹی کا پوری ملت نے اس شرعی موقف کا ساتھ دیا اور ہمیں فخر ہے کہ اس موقف کی وجہ سے ہمیں جیل خانے کی سعادت بھی حاصل ہوئی غیر شرعی سرکاری کمیٹی کی مسلسل ناکامی پر حکومت نے اسے توڑ دیا یہاں یہ بات خاص طور پر سمجھنے کی ہے کہ ہمارے اس موقف کی بنیاد اس پر نہیں تھی کہ حکومت کو چاند کے اعلان کا حق نہیں ہے بلکہ اس پر تھی کہ ثبوت ہلال کا فیصلہ شریعت اسلامیہ کے مطابق نہیں ہوا ہے کیونکہ وزیر داخلہ شرعی شہادت اور نصاب شہادت جیسے مسائل سے نابلد ہیں شریعت کے مطابق ثبوت ہلال کا فیصلہ اصل بنیاد ہے اور اعلان کا مسئلہ ثانوی ہے۔

حصول پاکستان کے چھ سال بعد ۱۹۵۴ء میں رویت ہلال کے مسئلے پر غور کرنے کے لئے ماہرین شریعت علماء کرام اور مفتیان عظام کا ایک اجتماع مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں ہوا اور اس پر برصغیر ہندو پاکستان کے ہر مکتب فکر کے علماء کے دستخط ہیں۔ یہ فتویٰ مفتی رشید احمد صاحب کی ترتیب دی ہوئی کتاب احسن الفتاوی میں موجود ہے جو پاکستان میں آسانی سے مل جاتی ہے۔

فتوی کے بعض اجزاء اقتباس کے طور پر نقل کئے جاتے ہیں۔

دفعہ ۲:۔ مجلس نے یہ بھی طے کیا ہے کہ اگر جماعت علماء مجاز کے سامنے احکام شرع کے تحت ہلال صوم یا فطر ثابت ہو جاتے اور اس کا اعلان ریڈیو میں حاکم مجاز کی طرف سے ہو تو حدود ولایت میں سب کو اس پر عمل کرنا لازم ہے۔

دفعہ ۸:۔ اختلاف مطالع صوم و فطر میں معتبر نہیں ہوگا بشرطیکہ دوسری جگہ ثبوت رویت

بطریق موجب ہو اس فتوے پر جن بیالیس علماء کے دستخط ہیں ان کے قابل ذکر نام یہ ہیں۔

مفتی محمود صاحب قاسم العلوم ملتان، مفتی عبداللہ صاحب خیر المدارس ملتان، مولانا خیر محمد صاحب، مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب، مولانا عبدالحق صاحب اکوڑہ خٹک، مفتی مسعود احمد نائب مفتی دارالعلوم دیوبند، مفتی رشید احمد صاحب، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا سعید احمد صاحب مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور، مولانا سید مسعود علی قادری مدرسہ انوار العلوم ملتان، مولانا ابوالحسنات قادری صاحب، مولانا محمد مصطفٰے الازہری صاحب کراچی۔

پھر ۱۹۶۷ء میں چار ممتاز علماء دین مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب، مولانا محمد یوسف بنوری صاحب اور مفتی رشید احمد صاحب نے اپنے دستخطوں سے ایک تحریر حکومت پاکستان کو بھیجی جو ماہنامہ ''البلاغ'' کراچی بابت ذی قعدہ ۱۳۹۳ھ کی اشاعت میں چھپ چکی ہے اس تحریر میں علماء پر مشتمل ایک مرکزی ہلال کمیٹی کی تشکیل اور پورے ملک میں اس کے فیصلے کے نفاذ کی سفارش کی گئی تھی جس کی بناء پر حکومت کی طرف سے قومی اسمبلی میں مرکزی نمائندوں کی رائے سے ہر مکتب فکر کے علماء پر مشتمل مرکزی رویت ہلال کمیٹی وجود میں آئی اس کے نام بھی اراکین اسمبلی نے خود تجویز کئے اس وقت ملک کے کسی عالم اور کسی مسلمان نے اس پر یہ اعتراض نہیں کیا کہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کا فیصلہ پورے ملک میں کیسے نافذ ہو سکتا ہے۔

چنانچہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی نے اپنے اجلاس لاہور منعقدہ ۲۸ اگست ۷۴ھ میں برصغیر ہندو پاکستان کے اکابر علماء کے متفقہ فیصلے کو اپنے طریق کار کی بنیاد قرار دیا اور یہ بھی اعلان کیا کہ رمضان وعیدین کے چاندوں کے بارے میں ثبوت ہلال کی بناء حسابی نظام قمری تقویم یا آلات جدیدہ کی تحقیق پر نہیں ہوگی بلکہ عینی روایت اور شہادت کے شرعی اصول پر ہوگی۔

اب ملک کے ہر مکتب فکر کے ممتاز علمائے دین کے واضح فتوؤں اور فیصلوں کے بعد بھی یہ کہنا کہاں تک درست ہو سکتا ہے کہ۔

۱۔ ایک مقام میں رویت ہلال کا فیصلہ پورے ملک پر کیسے نافذ ہو سکتا ہے۔

۲۔ ریڈیو وغیرہ کی خبر معتبر نہیں ہے۔

۳۔ رویت ہلال کمیٹی کے ارکان قابل اعتماد نہیں وغیرہ وغیرہ۔

پہلے دونوں اعتراض رویت ہلال سے متعلق شرعی اصول سے ناواقفیت پر مبنی ہیں کیونکہ برصغیر ہندو پاک کے ممتاز علماء کے فتوؤں سے اور ممتاز علماء پاکستان کی تصریح سے یہ بات طے ہوگئی کہ اختلاف مطالع شرعاً معتبر نہیں ہے اور حکومت کی نمائندہ کمیٹی کا فیصلہ پورے ملک کے لئے واجب العمل ہوگا اور ریڈیو سے جو چیز نشر ہو رہی ہے وہ ثبوت ہلال کا شرعی فیصلہ ہے شہادت نہیں ہے حدود پاکستان میں جہاں فیصلے کا اعلان پہنچے اس پر شرعاً عمل کرنا واجب ہے۔ اس مرکزی ہلال کمیٹی کے قیام سے پہلے جو ایک مقام کی رویت کو پورے ملک کے لئے تسلیم نہیں کیا جاتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ سرکاری ہلال کمیٹی شرعی معیار کے مطابق نہ تھی اور کسی نئی و پرائیویٹ ہلال کمیٹی کا فیصلہ شرعاً پورے ملک کے لئے واجب العمل نہیں ہوتا۔

ماہ رمضان کے چاند کے سلسلہ میں مرکزی رویت ہلال کمیٹی کی ذیلی کمیٹی کوئٹہ میں ثبوت ہلال کا شرعی فیصلہ دیدیا تھا جو اکابر علماء کے فتاویٰ کے مطابق اور ہمارے طے شدہ طریق کار کی رو سے اعلان کے لئے کافی تھا تاہم کراچی کے مختلف علاقوں سے بھی بہت بڑی تعداد میں عینی رویت کی شہادتیں مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے سامنے پیش ہوئیں اور دور دور سے گواہوں کے پہنچنے اور شہادتوں کے قلم بند کرنے کی بناء پر بھی فیصلہ میں غیر معمولی تاخیر ہوئی۔

شرعی تقاضوں کی روشنی میں ہر مکتب فکر کے علماء پر مشتمل مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے فیصلے سے علماء نے اختلاف کیا اور روزہ نہیں رکھا انہوں نے برصغیر ہندو پاکستان کے اکابر علماء کے فتاوی سے روگردانی کر کے شریعت اسلامیہ کی مخالفت کی اور روزہ نہ رکھ کر شعائر اسلام کی بے حرمتی کی ان پر توبہ اور روزہ کی قضاء لازم ہے۔

نظریہ پاکستان

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم۔

اَلحَمدُ لِلّٰہِ نَحمَدُہٗ وَنَستَعِینُہٗ وَنَستَغفِرُہٗ وَنُؤمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیہِ وَنَعُوذُ بِاللّٰہِ مِن شُرُورِ اَنفُسِنَا وَمِن سَیِّاٰتِ اَعمَالِنَا مَن یَّھدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضلِلہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشھَدُ اَن لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحدَہٗ لَا شَرِیکَ لَہٗ وَنَشھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَولَانَا مُحَمَّدًا عَبدُہٗ وَرَسُولُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیرِ خَلقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصحٰبِہٖ اَجمَعِینَ۔

اَمَّا بَعدُ! فَاَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ۔

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ۔

نظریہ پاکستان

دولفظوں کی یہ مرکب اصطلاح عوام وخواص میں جتنی زیادہ مشہور اور ملک کی موجودہ سیاست کا جس قدر اہم محور ہے اتنی ہی اس کی حقیقت سے ناواقفیت اور اس کے تاریخی پس منظر سے بے خبری انتہائی افسوسناک ہے۔ بلکہ تحریک پاکستان کے سلسلہ میں قائداعظم مرحوم کے رفقاء میں سے بعض کی غلط بیانی یا سرے سے نظریہ پاکستان کی نفی اور بھی زیادہ افسوسناک ہے۔ اصل میں نظریہ کا ماخذ نظر ہے جو عمل کے مقابلہ میں غوروفکر کے معنی میں آتا ہے نظریہ سے وہ سوچے اور غور کئے ہوئے اصول ہوتے ہیں جن کی حیثیت بنیادی ہوتی ہے اور جن پر عملی نظام کی عمارت قائم کی جاتی ہے۔ بالکل اس طرح جس طرح آسمانی دین و مذہب میں بنیادی عقائد کی حیثیت ہوتی ہے وہ عملی زندگی کا محور ہیں اور جائز وناجائز کی تمام قدریں اس کے گرد گھومتی ہیں۔ اس لئے کسی دین و مذہب کو بالخصوص اسلام کو نظریہ سے تعبیر کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ اسلام انسانی فکر اور سوچ بچار کا نتیجہ نہیں بلکہ وہ براہ راست اللہ کی وحی اور اس کی ہدایت پر مبنی ہے۔ اسی طرح لفظ پاکستان بھی درحقیقت کسی علاقہ کسی ملک اور جغرافیائی وطن کا نام نہیں ہے۔ بلکہ پاکستان ہندوستان کے مسلمانوں کی اس تحریک کا نام ہے جو آزادی ہند کی ہندو مسلم مشترک جدوجہد میں ہندوقوم کی رام راجی ذہنیت سے بیزاری کی وجہ سے بیسویں صدی کے وسط کے قریب شروع ہوئی اور اس تحریک کے نتیجے میں حاصل ہونے والے ملک کا نام بھی اس تحریک کے نام پر رکھ دیا گیا تا کہ قالب وروح یکجا ہو جائیں۔ چنانچہ نظریہ پاکستان سے وہ بنیادی اصول اور بنیادی منصوبے مراد ہیں جن پر تحریک پاکستان اٹھائی گئی اور جن کی بناء پر ہندوستان کے ان مسلمانوں نے بھی قربانیاں دیں جن کو یقین تھا کہ وجود میں آنے والا ملک ان کے علاقہ میں نہیں ہوگا۔ اس تحریک کی ابتداء اس وقت ہوئی جب ہندومسلمان دونوں نے کانگریس کے ذریعہ برطانوی راج کے خلاف بھرپور جدوجہد کی اور اس برصغیر کو انگریز کے اقتدار سے آزاد کرانے کا عزم کرلیا اور دوسری جنگ عظیم کے بعد بین الاقوامی سیاست کے حالات بھی تیزی سے بدل رہے تھے

اور برطانوی استعمار کی بالا دستی سمٹ رہی تھی آزادی ہند کی مشترکہ جدوجہد کے دوران ہندو ذہنیت کے پردے چاک ہوتے گئے اور یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ ہندو قوم ہر لحاظ سے مسلمانوں کی بدترین دشمن ہے اور ملک کی آزادی کے بعد اپنی پست ذہنیت اور رام راجی منصوبہ کا اظہار کر کے رہے گی یہیں سے دو قومی نظریہ پوری قوت سے ابھرا اور مسلمانوں نے برملا اپنی قومی وحدت کے تحفظ کا اعلان کر دیا چنانچہ قائداعظم نے اپنی سیاسی بصیرت سے بیک وقت دو دشمنوں یعنی انگریز اور ہندو قوم کے سامنے پاکستان کا مطالبہ پیش کر دیا اس مطالبہ کی بنیاد یہ تھی کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔ دین و مذہب تہذیب و تمدن اور ثقافت و روایات میں ہندو قوم سے کسی قسم کا رابطہ و اشتراک نہیں رکھتے۔ اس لئے اس برصغیر میں مسلمانوں کے لئے ایک الگ علاقہ چاہیئے۔ جہاں وہ آزادی کے ساتھ اسلام کے تقاضوں پر عمل کر سکیں اور انہیں اسلامی ثقافت کے احیاء میں پوری آزادی ہو انگریز کے جانے کے بعد مشترکہ ہندوستان میں اس کا کوئی امکان نہیں تھا چنانچہ مسلم لیگ نے ۱۹۴۰ء میں لاہور میں قرارداد پاکستان کے ذریعہ اپنے عزم کا اظہار کر دیا اسلام کے نام پر ایک نئی مملکت کے مطالبہ نے پوری قوم کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا اور محض اسلام کے اقتدار کا تصور ہی تھا۔ جس نے مسلمانوں میں بے نظیر اتحاد اور بے مثال ایثار و قربانی کی روح پھونک دی۔ اور مسلمانوں نے اس کو اپنی زندگی و موت کا مسئلہ بنا لیا۔ آخر کار اس نظریہ کی بنیاد پر ایک الگ مملکت پاکستان کے مطالبہ نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ علانیہ اور در پردہ سازشوں کے باوجود ہندو اور انگریز کو اس کی معقولیت کے سامنے جھکنا پڑا اور تقسیم ہند کی تجویز پاس ہو گئی اور بے حساب مال و املاک لاکھوں جانوں اور بے شمار عصمتوں کی قربانیوں کے بعد محض اسلام کے اصول اور منصوبوں کو بروئے کار لانے کے عظیم مقصد کی خاطر دنیا کی یہ سب سے بڑی اسلامی ریاست وجود میں آئی اس لئے جب ہم نظریہ پاکستان کہتے ہیں تو ایک ایسی مملکت مراد ہوتی ہے جس میں کتاب و سنت کی روح متحرک ہو اور جس میں جغرافیائی لسانی اختلافات اور قومی وحدت کو پارہ پارہ کرنے والی صورتوں کی کوئی گنجائش نہ ہو اس نظریہ کی بنیاد چونکہ کتاب و سنت کے اصول و مبادی پر قائم ہے اس لئے اس میں نہ ترمیم و تنسیخ کی گنجائش ہے اور نہ کسی ایک یا چند مادہ پرست منکرین کے نظریات کو اپنانے کی پاکستان کی

تحریک اوراس کے وجود و قیام کی کامیابی میں جو نظریہ کارفرما تھا وہی اس کی بقااور سالمیت و استحکام کا بھی ضامن ہے اسلام کے نام پر ملک حاصل کیا گیا اور اسلامی اصول وضوابط ہی اس کی عزت و وقار اور سربلندی کی علامت ہیں مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس کی حفاظت ہمارا دینی فرض ہے اس نظریہ سے ہٹ کر کسی ازم کو یا کسی نظریہ کو اپنانا گویا اسلام میں نقص وکوتاہی کا اعلان کرنا ہے الحمدللہ مسلمانوں میں بھی اسلامی شعور باقی ہے انہیں اس نظریہ سے نہ صرف جذباتی بلکہ ایمانی وابستگی بھی ہے۔ جو لوگ کسی بیرونی سازش کا شکار ہوکر یا دین کو نجی معاملہ سمجھ کر غیر اسلامی نظریات کی تبلیغ کررہے ہیں وہ درحقیقت پاکستان کے نظریہ سے غداری کررہے ہیں وہ کسی اور ملک کے دوست تو ہوسکتے ہیں لیکن پاکستان کے دوست نہیں کہلا سکتے۔ انشاء اللہ نظریہ پاکستان کو سربلندی حاصل ہوگی اور اسلامی اصول و قوانین پر یہ ریاست قائم ہوکر رہے گی۔

(ہفت روزصوت الاسلام لاہور)

اسلام اور سوشلزم

پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ اسے اسلام کے لئے ہی حاصل کیا گیا تھا۔ علمائے اسلام نے اسی مقصد کی خاطر تحریک پاکستان کی حمایت کی تھی کہ اس خطہ ارض میں اسلام کا پرچم سربلند ہوگا لیکن کچھ عرصہ سے لادینی اور سوشلسٹ عناصر نے اس طرح پرزے نکالے ہیں کہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے یہ عناصر بیس بائیس برس تک زیر زمین کام کرتے رہے اور عین اس وقت جب عوامی تحریک نے ایوب خان کی آمریت کی کمر توڑ دی تھی۔ پوری تحریک کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی۔

اب یہ مغالطہ پھیلانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ سوشلزم اور اسلام دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ بس ذرا نام مختلف ہے لیکن اسلامیان پاکستان کبھی اس فریب میں مبتلا نہیں ہو سکتے۔ وہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسلام اور سوشلزم دو متضاد اور انتہائی مختلف طریقہ ہائے زندگی ہے سوشلزم اور کمیونزم کا تو آغاز ہی انحراف مذہب سے ہوتا ہے۔ اس لئے دینی اور لادینی نظام ایک نہیں ہو سکتے۔ ان دونوں کے اجتماع کی کوئی صورت ممکن نہیں جب تک کہ سوشلزم یا اسلام دونوں میں سے کسی ایک کے مفہوم میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ دین خداوندی ہے کسی شخص کو اس میں سرمو تبدیلی کرنے کی بھی جرات نہیں ہو سکتی جو ایسا کرنے کی جسارت کرے گا وہ مسلمان ہی نہیں رہے گا۔ جہاں تک سوشلزم کا سوال ہے اس کے نظریات میں تبدیلی کا حق بھی اس کے بانیوں کو ہی پہنچتا ہے مقلدین کو نہیں کسی بھی نظریے میں اس کی تقلید کرنے والے من پسند کی ترمیم نہیں کر سکتے۔ اس لئے اس میں بھی ایسی کوئی گنجائش پیدا نہیں ہو سکتی۔ جو لوگ اس قسم کے دعوے اور باتیں کرتے ہیں وہ محض فریب دینے کے لئے یہ سوشلسٹوں کا ایک ہتھکنڈہ ہے جس سے وہ ملت اسلامیہ کو بیوقوف بنا کر اپنا مطلب نکالنا چاہتے ہیں لیکن انشاء اللہ انہیں اس مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوگی۔

اسلام سوشلزم کی اصطلاح

بعض حلقوں کی طرف سے اسلامی سوشلزم کی اصطلاح وضع کی گئی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اسے محض اسلام کے معاشی انصاف پر زور دینے کے لئے استعمال کیا جارہا ہے ہوسکتا ہے کہ بعض نوجوان ایسا نیک نیتی سے سمجھتے ہوں۔ ان کے پیش نظر صرف معاشی انصاف ہی ہو ان کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے میں یہ کہوں گا جب اسلام کے دامن میں ہر چیز موجود ہے تو پھر وہ ایک نئی اصطلاح گھڑنے کے تکلف میں کیوں پڑتے ہیں۔ حضور اکرمؐ کا اسوہ حسنہ سامنے رکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام کے ساتھ کسی چیز کا پیوند لگانے کی دین حق میں قطعاً کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔

اسلام دنیا کے کسی ازم کے ساتھ قطعاً کوئی سمجھوتہ نہیں کرسکتا۔ لادینی نظاموں کی تو بات ہی کیا۔ حضورؐ نے تو دوسرے مذاہب (جو کم از کم خدا کے وجود کے تو قائل ہیں) کے عقائد کے ساتھ پیوندکاری سے گریز کیا جب حضور اکرمؐ مدینہ طیبہ پہنچے تو دریافت فرمایا کہ عاشورہ کے دن یہود روزہ کیوں رکھتے ہیں؟ تحقیق کے بعد پتہ چلا کہ اس روز ان کے عقیدے کے مطابق حضرت موسیٰ اپنی قوم کو فرعون کے چنگل سے چھڑا کر لائے تھے اس پر آپؐ نے فرمایا کہ اس خوشی کو منانے کے ہم زیادہ حقدار ہیں لیکن ملت یہود اور امت اسلامیہ کے امتیاز کو برقرار رکھنے کے لئے ہم نو اور دس یا دس اور گیارہ تاریخ کا روزہ ملا کر رکھیں گے تا کہ دنیا کو یہ شبہ نہ ہونے پائے کہ اسلام کی عبادات اور اہل یہود کی عبادات یکساں ہیں۔

ایک مثال اور ملاحظہ ہو اسلامی عبادات میں سجدے کو بڑے اہمیت حاصل ہے ہمارے عقیدے کی رو سے سجدہ وہ عبادت ہے جس میں ایک بندہ اپنے خدا سے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے اس کے باوجود دین توحید نے آفتاب کے طلوع، غروب اور زوال کے وقت سجدہ کرنے کو ممنوع اور حرام قرار دے دیا اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ دنیا کی وہ مشرک قومیں جو سورج کی پرستش کرنے والی ہیں وہ ان تین اوقات میں سورج کی پوجا کرتی ہیں اسلام نے مشرک قوموں سے امتیاز قائم رکھنے کے لئے ان اوقات میں سجدے کو ہی حرام

قرار دے دیا ان دونوں مثالوں سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام دنیا کے کسی دوسرے مذہب کی خصوصیت کو اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں حالانکہ مذہب میں خدا کا تصور تو بہر حال موجود ہوتا ہے تو پھر کسی لادینی اور لامذہبی نظام کے کسی جز کو اسلام کی غیرت کس طرح قبول کر سکتی ہے جب کہ سرے سے اس کا دین ہی سے تعلق نہ ہو۔

نوجوانوں اور قائدین میں فرق

جیسا کہ میں نے عرض کیا بعض نوجوان تو نیک نیتی کے ساتھ اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگا سکتے ہیں لیکن ان کے قائدین کی نیت میں نیکی نہیں فتور ہے ان کی زندگیوں اور کردار کی طرف دیکھئے تو ان کا جھوٹ خود بخود دم توڑ دے گا۔ وہ نام تو اسلامی سوشلزم کا لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے ان کی مراد اسلامی معاشی انصاف ہے لیکن ان کی زبان سے ماؤ کے اقوال جھڑتے ان کے رسالوں میں روس اور چین کو نمونہ بنا کر پیش کیا جاتا اور ان کے جلسوں میں نعرہ تکبیر سے بھی چڑ محسوس کی جاتی اور لا الہ الا اللہ کے بینروں پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ وہ شعائر اسلامی کا مذاق اڑاتے ہیں چیئرمین ماؤ کی نقال کرنے میں فخر محسوس کرتے اسی کی ادائیں اپناتے اور زبان سے پھر یہ کہتے ہیں کہ ہم اسلام کی سربلندی کے لئے ہی وقف ہیں تو پھر مجھے بتایا جائے کہ غیر اسلام کسے کہتے ہیں۔ لادینی کیا ہے اور بے راہ روی کس چیز کا نام ہے اسلامی سوشلزم کے نعرہ کو بے ضرر سمجھنے والے نیک نیت نوجوان جن کے دل میں اسلام کی محبت بھری ہوئی ہے ذرا ان قائدین کو دیکھیں ان کی زندگیوں کا جائزہ لیں تو انشاءاللہ ہمارے قریب آ کر رہیں گے ان پر اس نعرے کا فریب خود بخود واضح ہو جائے گا۔

نفرت انگیزی کی مہم

بعض حلقوں کی طرف سے علمائے اسلام پر یہ الزام عائد کیا جا رہا ہے کہ وہ اسلام کے نام پر نفرت انگیزی کی مہم چلا رہے ہیں یہ ایک صریح جھوٹ ہے اسلام مثبت اور ایجاب پر زور دیتا ہے دوسری طرف لادینی عناصر کی بنیادی نفی پر ہوتی ہے نفرت انگیزی کی مہم وہی چلاتے ہیں اور یہ ان کی ایک پروپیگنڈا تکنیک ہے کہ جرم تو خود کرو۔ الزام دوسروں کے سر

تھوپ دو۔ میں کسی مخصوص جماعت یا گروہ کی نہیں پورے علماء اسلام کی بات کر رہا ہوں کہ وہ نہ تو اس طرح کی کوئی مہم چلا رہے ہیں اور نہ ہی اس میں کوئی افادیت سمجھتے ہیں۔ نفرت انگیز تو سوشلسٹ ہیں جو ملک کی نظریاتی بنیادوں پر ضرب لگانا چاہتے ہیں ہم اپنے اساسی نظریات کی بیخ کنی گوارا تو نہیں کر سکتے کیا سوشلسٹ حضرات یہ چاہتے ہیں کہ وہ ہماری قدروں اور ملی شعائر کے خلاف نفرت پھیلاتے رہیں لوگوں کے جذبات بھڑکاتے رہیں اور ہم گھروں میں بند ہو کر کانوں میں روئی ٹھونس کر بیٹھ جائیں ان کی یہ تمنا کبھی پوری نہیں ہوگی علمائے اسلام نے ہر دور اور ہر زمانے میں اسلام کا پرچم بلند رکھا ہے وہ اسی کسی طور اور کسی حال میں بھی جھکنے نہیں دیں گے۔ یہ پرچم کبھی سرنگوں نہیں ہوگا۔

جماعت اسلامی، سوشلزم اور اسلام

میں یہ بات محسوس کر رہا ہوں کہ سوشلسٹ حضرات نے اسلام کو جماعت اسلامی کے ساتھ مخصوص کر رکھا ہے وہ اسلام پر براہ راست حملہ کرنے کی جسارت تو نہیں کر سکتے اس لئے جماعت اسلامی ...... کو گالی دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں وہ لوگوں میں یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ صرف جماعت اسلامی ہی سوشلزم کی مخالفت کر رہی ہے یہ یقیناً ایک بہت بڑا جھوٹ ہے علمائے اسلام نے تو مولانا عثمانی مرحوم کی زیر قیادت اس وقت لادینی قوتوں کے خلاف جدوجہد کا آغاز کیا تھا جب جماعت اسلامی کا کہیں نام تک نہ تھا۔ پاکستان کا صحیح الفکر عالم دین سوشلزم کا مخالف ہے اس سے کوئی بھی سمجھوتہ نہیں کر سکتا وہ علماء جنہوں نے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی قیادت میں پاکستان کے حصول کے لئے جدوجہد کی تھی ان کا فرض ہے کہ اب سوشلزم کے فتنے کو کچلنے کے لئے بھی کمر ہمت کس لیں اس سلسلہ میں مولانا ظفر احمد عثمانی کو پہل کرنی چاہئے کہ جمعیت العلمائے اسلام میں مولانا شبیر احمد عثمانی کے بعد انہی کی ذات سب سے زیادہ مکرم اور مقتدر ہے جمعیت العلماء اسلام کے نام سے جو لوگ سرگرم ہیں انہیں تحریک پاکستان سے دور کا بھی واسطہ نہیں یہ سب نظریہ پاکستان کے دشمن تھے انہی لوگوں سے ہم نے مولانا شبیر احمد عثمانی کی زیر قیادت جنگ لڑی

تھی۔ اب انہوں نے جمعیت العلمائے اسلام کے نام پر ہی قبضہ کرلیا ہے اس وقت تحریک پاکستان سے بھی زیادہ فیصلہ کن مرحلہ درپیش ہے اب ہمیں نظریہ پاکستان کے بقاء کی جنگ لڑنی ہے کانگریسی علماء نے اس نظریے کی بیخ کنی کے لئے اس وقت بھی کوشش کی تھی جب ہم پاکستان کی جنگ لڑ رہے تھے اور وہ آج بھی اپنا وزن اسی نظریے کے مخالفین کے پلڑے میں ڈال رہے ہیں جمعیت العلمائے اسلام کے بانیوں اور مولانا شبیر احمد عثمانی کے نام لیواؤں کا فرض ہے کہ وہ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔

علماء اور سرمایہ داری

علماء پر ایک الزام ایک مخصوص ذہن کے حاملین کی طرف سے بار بار یہ لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے سرمایہ داری نظام کے ساتھ سمجھوتہ کرلیا تھا اور گذشتہ بیس برس تک انہوں نے اس کے خلاف کوئی مہم نہیں چلائی۔ حالانکہ علماء کی طرف سے بار بار اس بات کا اعلان کیا جاتا رہا ہے اور کیا جارہا ہے کہ ہمارے نزدیک سرمایہ داری بھی ویسی ہی لعنت ہے جیسی سوشلزم۔ فرق صرف یہ ہے کہ سرمایہ داری کی انتہاء انکار مذہب پر ہوتی ہے اور سوشلزم کی ابتداء اسی سے ہوتی ہے جب پاکستان قائم ہوا تو علماء نے اپنی پوری کوششیں اسلامی دستور کی تدوین کی طرف لگا دیں ہمیں نے ۱۹۵۰ء میں ہر مکتب فکر کے علماء کا کنونشن کراچی میں طلب کر کے متفقہ دستوری سفارشات پیش کی تھیں ۱۹۵۶ء میں ہمیں ایک دستور مل گیا جو آئیڈیل نہ سہی لیکن غنیمت ضرور تھا اس طرح ہماری جدوجہد کا ایک مرحلہ ختم ہو گیا ہمارا خیال تھا کہ اب آزادانہ انتخابات منعقد ہوں گے اور یوں ایک پاکیزہ جمہوری معاشرہ قائم ہو جائے گا جس میں ہم اسلامی اصولوں کی روشنی میں اپنے تمام مسائل حل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

لیکن بسا آرزو کی خاک شدہ...... ۱۹۵۶ء کے آئین کو کام کرنے کا موقع ہی نہ ملا اور ملک پر ایوب خان کی آمریت مسلط ہو گئی اب اس سے گلو خلاصی ہوئی ہے تو ہم انشاء اللہ اسلامی اصولوں کے مطابق معاشی اور دوسرے نظاموں کے قابل عمل خاکے مرتب کریں گے۔

ویسے اگر میں یہ بات عرض کر دوں تو بے جا نہیں ہو گا کہ سرمایہ داری کو اس ملک میں

مضبوط کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ نوکر شاہی اور سوشلسٹ حضرات کا ہے جب پاکستان قائم ہوا تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ سوشلسٹ تحریک کا مستقبل برصغیر کے اس حصے میں تو تاریک ہوگیا ہے اس پر سوشلسٹوں نے معاشرے کو افراتفری میں مبتلا کرنے کا منصوبہ بنایا۔ انہوں نے بیوروکریسی میں اپنے آدمی گھسیڑے۔ نوکر شاہی کے لادین ذہنوں کو خریدا اور پوری کوشش کی کہ اس ملک پر سرمایہ داری کا شکنجہ سخت سے سخت تر ہو جائے۔

انہیں یہ بات معلوم تھی کہ سرمایہ داری کا ردعمل افراتفری کی صورت میں ہی ظاہر ہوگا صنعت کاروں اور مزدوروں نیز معاشرے کے دوسرے طبقات کے درمیان نفرت کی دیواریں حائل ہو جائیں گی اور نفرت کے اس ماحول اور فضاء میں سوشلزم کا نعرہ لگا کر غریبوں اور محنت کشوں کو اپنے پیچھے لگا لیا جائے گا دنیا بھر میں جہاں بھی سوشلسٹ انقلابات آئے ہیں وہ اسی فضاء میں برباد ہوئے ہیں۔ یہ نظریہ نفرت ہی کے ماحول میں پروان چڑھتا ہے چنانچہ بیوروکریسی کے لادین اور سوشلسٹ عناصر نے سرمایہ داری کو فروغ دینا شروع کیا۔

عام انتخابات نہ منعقد ہونے دیئے اسلامی دستور کی راہ میں روڑے اٹکائے ......اور پھر ایوب خان کی آمریت کے دست و باز و بن کر اپنے نظریے کو فروغ دینے کے طویل المیعاد منصوبے پر عمل کرتے رہے......اس طرح ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت پاکستان میں سوشلزم کو مقبول بنانے کی سعی کی گئی ہے کیونکہ علمائے اسلام کی موجودگی میں یہ حضرات عامۃ الناس میں مقبولیت حاصل نہیں کر سکتے اس لئے ان پر سرمایہ داری کی حمایت کا سراسر جھوٹا اور بے بنیاد الزام تھوپ رہے ہیں۔

ان عناصر کے مستقل سدباب کے لئے ضروری ہے کہ جس طرح بدعنوان عناصر کے خلاف تطہیر کی مہم شروع کی گئی ہے......اسی طرح ان افسران کا بھی پتہ چلایا جائے جنہوں نے وطن عزیز کی نظریاتی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کی سعی کی۔ درس گاہوں ذرائع نشر و اشاعت اور ایسے دوسرے تمام محکموں سے ان عناصر کو نکال باہر کرنا ضروری ہے بعض لوگ اس سلسلے میں شور مچا رہے ہیں اور ہمارے اس مطالبے کو سراسر غیر انسانی فعل قرار دے رہے ہیں ان انسانیت نوازوں سے کوئی پوچھے کہ اگر کوئی راشی بدمعاش اور خیانت کار افسروں کے خلاف کارروائی کے خلاف شور مچائے تو کیا اسے حق بجانب سمجھا جائے گا اگر جواب نفی

میں ہے تو پھر نظریاتی خیانت کاروں اور خدا اور رسول کی تعلیمات کے خلاف نفرت پھیلانے والوں کو کیونکر معاف کیا جا سکتا ہے...... ایسے لوگوں کو سزا دینا غیر انسانی نہیں سراسر انسانی فعل ہے۔ ان لوگوں نے تحریک پاکستان کے مقاصد کو پس پشت ڈالا اور ملت اسلامیہ سے اس کا بلند نصب العین چھیننے کی سعی کی ہے اس کی انہیں مزید اجازت ہرگز نہیں دینی چاہئے...... سزا کے مستحقین کو چھوڑ دینے سے معاشرے کا نظام درہم برہم ہو جائے گا یہاں یہ بات طے ہو جانی چاہئے کہ ہم نام نہاد آزادی اور ترقی پسندی کے نام پر کسی کو اپنے عقائد اور نظریات سے کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتے...... جن لوگوں کی عقل میں یہ موٹی سی بات بھی نہیں آتی وہ اپنے ہوش وحواس میں نہیں ہیں اور دانستہ یا نادانستہ ان عناصر کے ہاتھ میں کھیل رہے ہیں جو اس ملک کی نظریاتی سرحدیں ڈھانا چاہتے ہیں۔

علماء کا کنونشن

انشاء اللہ بہت جلد مختلف مکاتیب فکر کے علماء کا ایک کنونشن طلب کیا جائے گا۔ جس میں اسلامی معاشی نظام کو ایک متفقہ اور مربوط خاکہ پیش کیا جائے گا جس طرح ۱۹۵۰ء میں علماء نے دستوری مسائل پر ایک متفقہ فارمولا تیار کیا تھا اسی طرح اسلامی معاشی نظام کو بھی مرتب کر لیا جائے گا ہم سوشلزم کا چیلنج قبول کرتے ہیں اور اسے یہاں دفن کر کے دم لیں گے۔ یہ ملک اسلام کے لئے بنا ہے اور انشاء اللہ یہاں اسلامی حکومت قائم ہو کر رہے گی اور اسلامی معاشرہ جنم لے کر رہے گا۔

مرکزی جمعیۃ علماء اسلام کی مجلس شوریٰ میں

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور مولانا تھانویؒ کا خطاب

الحمدللہ وکفٰی وسلام علی عبادہ الذین اصطفٰی اللّٰھم فاطر السموات والارض عالم الغیب والشھادۃ انت تحکم بین عبادک فیما کانوا فیہ یختلفون اما بعد۔

آپ حضرات کو معلوم ہے کہ یہ ناکارہ جمعیت علماء اسلام میں تقریباً ابتداء ہی سے شامل رہا اور جو کچھ خدمت بن پڑی مقدور بھر انجام دیتا رہا اور کوشش ہمیشہ یہ رہی کہ اسلام کے مجمع

علیہ مسائل کو مقصد زندگی بنا کر اس میں زیادہ سے زیادہ مسلم جماعتوں کا اشترک و تعاون حاصل کیا جائے خصوصاً مختلف مکاتب فکر کے علماء کو اس مقصد پر جمع کیا جائے فروعی اختلافات کو صرف حلقہ درس اور فتویٰ کی حدود تک رکھا جائے، اخبارات اور عوامی جلسوں میں یہ بحثیں نہ اٹھائی جائیں۔ کیونکہ پاکستان بلکہ پورے عالم اسلام کو اس وقت کفر والحاد کے جن فتنوں سے سابقہ پڑا ہوا ہے ان کا سیلاب طوفانی رفتار سے بڑھ رہا ہے۔ ملک کی دینی جماعتوں میں کوئی بھی تنہا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

اسی لئے علماء کے افتراق کو کسی قیمت پر برداشت کرنا گوارا نہ تھا یہی وجہ تھی کہ جب ملتان میں کچھ حضرات نے اصلی جمعیت کے بالمقابل ایک نئی جمعیت کھڑی کر دی تو باہمی مذاکرات اور مکاتبات کے ذریعہ اس افتراق کو مٹانے کی کوشش تو عرصہ دراز تک جاری رکھی مگر اخباری بیانات سے احتراز کیا اور جب دوسری طرف سے اشتراک عمل کی ہر کوشش ناکام کر دی گئی اس وقت بھی اظہار مخالفت سے سکوت کو اسلم سمجھا اور اصلی جمعیت کئی سال اسی سکوت کے عالم میں رہی۔

یہ نئی جمعیت اگر چہ پہلے دن ہی سے جمعیت علمائے اسلام کے مزاج اور طرز عمل سے بالکل مختلف انداز سے چلتی رہی مگر اب تک اظہار اختلاف سے گریز کیا گیا۔

لیکن اس وقت جب کہ پاکستان بلکہ پورے عالم اسلام پر کمیونزم اور سوشلزم کا طوفان منڈلا رہا ہے اور بہت سے اسلامی ممالک کو زیروزبر کر چکا ہے وہاں شعائر اسلام کو مٹا رہا ہے، اس کا مقابلہ پوری اسلامی اور دینی جماعتیں اپنی پوری توانائی صرف کر کے کریں تو ممکن ہے کچھ مقاومت ہو سکے عین اس وقت اس نئی جمعیت کے سربرآوردہ علماء نے بعض ایسی جماعتوں کے ساتھ اشتراک عمل شروع کر دیا جو زمانے سے سوشلزم کی بڑی داعی ہیں اور جنہوں نے پچھلے دنوں ملک میں وہی انقلابی فساد کرائے جو کمیونسٹوں کا اصول ہے اور آج بھی ان کے عمل کا کوئی رخ اسلام کی طرف نہیں ہاں اپنی جدید پالیسی کے ماتحت انہوں نے اسلام کا نام لینا ضرور شروع کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے شعوری یا لاشعوری طور پر ہمارے یہ علماء ان سے جا ملے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اس جمعیت العلماء کا پورا وزن

سوشلسٹوں کے پلہ میں پڑ گیا اور پاکستان کو بھی وہی خطرہ لاحق ہو گیا جس نے مصر شام، عراق میں اور سوڈان کو تہ وبالا کر کے اسلام اور اسلامی شعائر کو ختم کر ڈالا ہے۔

اس وقت علماء بالخصوص علمائے دیو بند کے نام سے جو جماعت عوام کے سامنے آئی ہوئی ہے وہ یہی جماعت ہے جس کا طرز عمل بار بار کی افہام وتفہیم کے باوجود یہ ہے، اگر اصلی جمعیت علمائے اسلام کے حضرات اور دوسرے علماء اس وقت ان سے اختلاف کا اظہار نہ کریں تو مسلمان اسی آواز کو سب علماء کی آواز سمجھنے میں معذور ہوں گے اور دنیا وآخرت کی ذمہ داری سب علماء پر عائد ہوگی۔

اسی لئے پورے ملک کے دیندار طبقے اور علماء نے وقت کی نزاکت کو محسوس کر کے حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی اصل جمعیت کی نئ تشکیل اور سوشلزم کے مقابلہ میں پوری قوت سے کام کرنے پر زور دیا۔ وفود خطوط اور اخباری بیانات کا تانتا بندھ گیا تو اب بنام خدا تعالیٰ اس جمعیت کی مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس طلب کر لیا گیا۔

آپ حضرات کے علم میں ہوگا کہ میں تقریباً دس مہینے سے مسلسل بیمار صاحب فراش رہا۔ اب افاقے کے باوجود صحت کسی کام کرنے کے قابل نہیں ہے اس لئے گذارش ہے کہ نئ تشکیل میں احقر کے ذمہ کوئی عہدہ نہ رکھا جائے، مقدور بھر میری تائید انشاءاللہ جمعیت کے ساتھ رہے گی۔

آخر میں ایک ضروری گذارش سب ارکان جمعیت سے یہ ہے کہ آپ کا اصل ہدف سرمایہ دارانہ نظام اور سوشلزم دونوں کے خلاف خالص اسلامی نظام ہے۔ کسی مسلم جماعت سے اختلاف آپ کا ہدف نہیں، نئ جمعیت کے حضرات اگر آپ کے راستے میں حائل ہوں تو جہاں تک دشنام طرازی کا معاملہ ہے اس کے مقابلے میں صبر وتحمل سے کام لیا جائے۔

کیونکہ سوشلسٹ گروہ کا طے کیا ہوا طعنہ کہ جو اسلام کا نام لے اس کو امریکن سامراج کا ایجنٹ کہنے میں خدا سے نہ ڈریں نہ آخرت کی باز پرس سے جو لوگ یہی کام کرنے لگیں ان کے اس بہتان کو انہیں کے حوالے کیجئے آپ ان کو سرخ سامران کا ایجنٹ کہہ کر انتقام نہ لیں۔

ہاں اگر کوئی چیز خلاف واقع آپ کی طرف منسوب کی جائے یا کسی دلیل سے اپنی روش کے درست ہونے پر استدلال کیا جائے تو اس کا مکمل جواب قرآنی تعلیم بالتی ھی احسن

کے اصول پر دے کر اپنے مثبت کام میں مشغول ہو جائیں ان سے اختلاف کے منفی پہلو پر اپنی توانائی کو ضائع نہ کریں۔

ہمارے جو علماء اس طرح سوشلسٹ گروہ کو تقویت پہنچا رہے ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ ہم امریکن سامراج کو مٹانا چاہتے ہیں بلاشبہ انگریز اور امریکہ کا لایا ہوا نظام سرمایہ داری ہی ہر فساد کی بنیاد ہے اسی نے کمیونزم اور سوشلزم کو جنم دیا ہے، اس کی مخالفت لازمی ہے۔ لیکن مخالفت کا ایک آئینی طریقہ ہے کہ اس نظام کی بنیاد جن چیزوں پر ہے ان کو مٹایا جائے مثلاً سود سٹہ، قمار اور لائسنس پرمٹ کا مروجہ طریقہ جس کے ذریعہ سیاسی رشوتیں دی جاتی ہیں۔ اور لوگوں کے ایمان خریدے جاتے ہیں آئینی طور پر ان چیزوں کے مٹانے کی کوشش کریں یہ تو وہ کام ہے جس کو علمائے اسلام ہر زمانے اور ہر دور میں اپنی مقدرت کے مطابق کرتے آئے ہیں، اور آج بھی اگر نظام سرمایہ داری کو اسلامی اصول کے تحت ہٹایا جا سکتا ہے تو اس کا یہی طریق ہے کہ آئینی طریقوں سے ان قوانین کو ختم کرایا جائے جو اس ظلم و جور کا ذریعہ بن رہے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام معیشت جو ملک کی دولت کو چند افراد یا چند خاندانوں میں محصور کر کے ملک کے عوام کو فقر و افلاس کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ اسلام اس کا شدت کے ساتھ مخالف ہے۔ اشتراکیت بھی اگرچہ اس کی مخالفت کا دعویٰ کرتی ہے مگر مخالفت کی راہیں بالکل الگ ہیں اسلام اس باطل نظام معیشت کو اسی طرح مٹاتا ہے کہ ارتکاز دولت کے ہر دروازے کو بند کرتا ہے، ایسے اصول کو بروئے کار لاتا ہے جس سے دولت کی گردش تیز اور عام ہو کہیں مرتکز ہو کر نہ رہ جائے۔ کوئی انسان ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے، کسی کی مجال نہ ہو کہ محنت کش مزدوروں کی حق تلفی کرے۔

اور کمیونزم یہ کرتا ہے کہ محنت کش مزدوروں کے جذبات کو بھڑکا کر غاصبانہ انقلاب کے ذریعہ سے ان کو مل مالک بن جانے کا سبز باغ دکھاتا ہے جو سوشلسٹ ملکوں کے تجربوں اور شہادتوں کی رو سے غریب مزدوروں کے ساتھ ایک فریب ہے اور اسلامی اصول اور نصوص کے خلاف بھی جس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ پورے ملک کا سرمایہ حکومت کے قبضے میں آ کر غریب مزدور فریاد کرنے کے حقوق سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔

ہمارے جو علماء اس وقت یہ خیال کر رہے ہیں کہ ہم سوشلسٹ جماعتوں کے ساتھ اشتراک عمل کر کے اینگلو امریکن سامراج کا خاتمہ کر دیں گے پھر اس ملک میں اسلامی نظام رائج کریں گے۔ اگر ان حضرات کی روش یہی رہی جو آج ہے تو اس طریقے سے یہ تو ممکن ہے کہ وہ موجودہ نظام کو ختم کر دیں۔ لیکن اس کی جگہ یہاں اسلام آ جائے اس کا کوئی امکان نہیں یہ راستہ صرف سرخ سامراجی سوشلزم کو مسلط کرنے کا ہے اور یقین ہے کہ یہ بات خود ان حضرات پر بھی واضح ہو جائے گی مگر یہ اس وقت ہوگا جب خدا اور مذہب کے دشمن اپنے پنجے مضبوط کر چکے ہوں گے خود ان حضرات کو بھی اسلام کا نام لینا آسان نہ رہے گا۔ حق تعالیٰ ان کو اور ہم سب کو اس عذاب سے محفوظ رکھے آمین۔

بہر حال آج جو علماء اس مغالطے میں ہیں ان سے اختلاف کے وقت بھی یہ ضروری ہے کہ علماء کے احترام کو دین کا احترام سمجھ کر برائی کا جواب بھلائی سے دیا جائے تا کہ ہمارے جو بھائی ایک غلط اور خطرناک روش پر پڑ گئے ہیں قرآنی وعدے کے مطابق پھر آپ سے آملیں۔

ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک وبینه عداوة کانه ولی حمیم.

اس کے علاوہ اس طرز سے جو علماء کا اختلاف منظر عام پر آئے گا وہ انشاء اللہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے مضر بھی نہ ہوگا۔

حق تعالیٰ ہمیں تمام علماء کو تمام دینی جماعتوں اور مسلم عوام کو سرمایہ دارانہ نظام کی مصیبت اور سوشلزم کے عذاب سے نجات عطا فرمائے۔ **واللہ المستعان وعلیه التکلان.**

مرکزی جمعیت علماء اسلام کی مجلس شورے میں

حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانویؒ کا بیان

میں احیاء، جمعیت علماء اسلام کے اس اجلاس پر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں جس میں ہر مکتب فکر کے علماء اور ملت کے وہ اکابر جمع ہیں جنہوں نے اپنی بے مثال جدوجہد سے اس جمعیت کے ذریعہ ایک عظیم الشان اسلامی ملک پاکستان حاصل کیا۔ پھر علماء اس زمانے میں جبکہ تحریک پاکستان سے اختلاف رکھنے والے علماء ہاتھ پر

ہاتھ رکھے ہوئے خاموش تھے حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کی قیادت میں انہوں نے قرارداد مقاصد پاس کرانے کا تاریخی کارنامہ انجام دیا اور صرف یہی نہیں بلکہ مسلک حق کے تحفظ کی خاطر تحریک پاکستان سے اختلاف رکھنے والے علماء کے ساتھ بھی مراسم استوار کئے تاکہ سب مل کر پاکستان کو ایک مثالی اور اسلامی سلطنت بنا سکیں اور عام پاکستانی مسلمان ان علماء سے بعد اور اجنبیت کو دور کردیں مگر ان حضرات نے اپنی سیاسی جمعیت پاکستان کے بانی علماء کے ساتھ بھی رواداری نہیں اختیار کی بلکہ جمعیت علماء اسلام کی تنظیم اور اس کے نام کو اپنے ان مخصوص افکار و خیالات کے لئے استعمال کیا جو نہ نظریہ پاکستان سے میل کھاتے ہیں اور نہ اسلام سے اور سیاسی اخلاق کے اعتبار سے بھی یہ بات نہایت خفیف ہے۔

ایوب کی دس سالہ آمریت کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی جب غیر ملکی اور لادینی نظریات سے وابستہ عناصر نے سوشلزم کا نعرہ لگایا جو براہ راست اسلام کے خلاف اور بالواسطہ پاکستان کی شیرازہ بندی کے خلاف تھا تو ملک کے بانی حضرات علماء اور عام اسلام پسند مسلمانوں کو اس بات پر حیرت ہوئی کہ جمعیت علماء اسلام کی تنظیم کو استعمال کرنے والے حضرات علماء نے نہ صرف یہ کہ اس نعرہ کی تائید کی بلکہ سوشلسٹ عناصر کے ساتھ مل کر مشترکہ جدوجہد کا معاہدہ بھی کیا۔ عالم اسلام میں سوشلسٹ عناصر کی اسلام کے خلاف جارحانہ روش اور تباہی کے کارنامے بالکل الم نشرح ہو چکے ہیں پاکستان میں بھی جا بجا تشدد کے واقعات سے نتیجہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، ایسی صورت میں اسلام اور نظریہ پاکستان کا درد رکھنے والے علماء حق کا فرض تھا کہ وہ اس فتنے کی روک تھام کے لئے تیار ہو جاتے مفتی محمد شفیع صاحب نے بحالی جمعیۃ کا اقدام فرما کر ملت کے جذبات کی ترجمانی فرمائی ہے میں پندرہ سال سے کسی جمعیت اور تنظیم سے وابستہ نہیں ہوں اور نہ اب بھی کسی تنظیم کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار ہوں مگر باضابطہ وابستگی کے بغیر بھی میں ہر خدمت کے لئے تیار ہوں اور اگر دوسری اسلام پسند جماعتوں کے ساتھ بھی میں اس مسئلہ میں تعاون کرتا ہوں تو مرکزی جمعیت میں امت کے اکابرین کے ساتھ میں خادمانہ طور پر کیوں تعاون نہ کروں گا۔ حکومت کی بعض دھمکیوں پر حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ اگر حکومت کے افراد میرا منہ کالا کر کے گلے

میں جوتوں کا ہار ڈال کر گدھے پر بٹھا کر جلوس نکالیں تب بھی میں اسلامی آئین کے مطالبہ سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہوں اسی طرح میں بھی عرض کرتا ہوں کہ مقابل اور حریف اپنے تمام اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنے کا حوصلہ پورا کرلیں تب بھی میں سوشلزم اور اسلامی سوشلزم کی مخالفت سے باز نہیں آسکتا حق تعالیٰ ہم سب کو حق پر ثابت قدم رکھے۔ آمین۔

موچی دروازہ لاہور میں ایک معرکۃ الآراء تقریر

۱۶ رمئی ۱۹۷۰ء کو مرکزی جمعیت علماء اسلام کے زیر اہتمام ہونے والے ایک روزہ عظیم الشان کانفرنس میں قائد مرکزی جمعیت علماء اسلام حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانویؒ کا ایمان افروز خطاب

جناب صدر حضرات علماء کرام اور معزز حاضرین جلسہ!

آج میں مغربی پاکستان کے ایک ایسے مشہور شہر میں اپنے دوستوں سے خطاب کر رہا ہوں جس کو پاکستان کا قلب کہنا صحیح ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ زندہ دلان لاہور کو اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصیت عطا فرمائی ہے کہ جس تحریک کا آغاز لاہور سے ہو اس میں صرف نوجوانوں کے جذبات ہی شامل نہیں ہوتے بلکہ اللہ کا فضل اور اس کی نصرت بھی شامل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ پاکستان کی تحریک کی ابتداء بھی آپ کے اسی مشہور شہر سے ہوئی جب کہ ۴۰ء میں یہاں پاکستان ریزولیشن اور قرار داد پاس کی گئی پھر مجھے وہ وقت بھی یاد ہے کہ آج سے قریباً آٹھ مہینے پہلے جب سوشلزم کے خلاف ہم نے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا تھا تو سب سے پہلے ہم نے لاہور ہی سے اس کام کو شروع کیا تھا۔ اور اسی کی برکت تھی کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے آٹھ مہینے میں آج ہم گھوم پھر کر پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں خواجہ صاحب کا شعر یاد آتا ہے ؎

مقام فنا تک جو پہنچے ہیں اے دل   تو مر مر گئے ہیں مگر آ گئے ہیں

آج ہم پھر اسی شہر میں فاتحانہ حیثیت سے آپ کے سامنے موجود ہیں اس لئے کہ سوشلزم اور لادینی نظاموں کی ظلمتوں کو جو گھٹا چھا گئی تھی الحمدللہ کہ علماء کی جدوجہد سے اس طرح چھٹی ہے جس طرح کہر آفتاب کی شعاعوں سے کافور ہو جاتی ہے اور الحمدللہ پھر اسلام کے لئے فضا بن گئی وجہ یہ ہے کہ زندہ دلان لاہور کا یہ لقب خالی خول نہیں ہے علامہ اقبال

مرحوم کا شعر ہے کہ ؎

دل مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے ملتوں کے مرض کہن کا چارہ

یہ زندہ دل بڑی سے بڑی مہم سر کرنے کی ضمانت ہے الحمدللہ آج مرکزی جمعیت علماء اسلام کا کھلا اجلاس آپ کے سامنے ہے جہاں بہت بڑی تعداد میں مسلمان جمع ہیں اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان میں کوئی مسلمان کرائے سے نہیں بلایا گیا کیونکہ جس طریقہ سے یہ لوگ اجتماعات کرتے ہیں ہمیں سب اندر کے راز معلوم ہیں۔ اور ہم ان لوگوں کی اس قسم کی باتوں سے متاثر نہیں ہوئے۔ اکبر مرحوم فرماتے ہیں۔

ساری دنیا آپ کی حامی سہی ہر قدم پر مجھ کو ناکامی سہی
نیک نام اسلام میں رکھے خدا کفر کے حلقے میں بدنامی سہی

الحمدللہ یہ اجتماع جو آپ کے سامنے ہے خالصتاً ان مسلمانوں کا ہے جو اسلام کی تڑپ اپنے دل میں رکھتے ہیں اور اپنے جذبے سے متاثر ہو کر یہاں جمع ہوئے ہیں۔ وقت کافی ہو چکا ہے اس وجہ سے میں آپ کا کوئی لمبا چوڑا وقت نہیں لوں گا صرف چند باتیں آپ سے عرض کرنی ہیں۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ آج پاکستان جس نرغے اور جس بھنور میں پھنسا ہوا ہے اس پر مجھے وہ تمام جدوجہد یاد آ گئی جب ہم قیام پاکستان کے وقت گلی گلی کوچہ بکوچہ پھرتے تھے اور ہمیں یہ بھی یاد ہے کہ اس وقت بعض لوگ یہ کہا کرتے تھے کہ ارے پاکستان میں جوتیوں میں دال بٹے گی وہاں ایسا ہوگا۔ وہاں ویسا ہوگا۔ لیکن ہم جواب میں یہی کہتے تھے ؎

بجلیوں کی زد میں جب آئے گا دیکھا جائے گا
کچھ نہ کچھ قائم بنائے آشیاں ہونے تو دے

آج وہ آشیاں بجلیوں کی زد میں آیا ہوا ہے آج ۲۳ سال پہلے کی باتیں آنکھوں کے سامنے ہیں اسی میں سے ایک بات میں آپ سے عرض کرتا ہوں۔

۱۹۴۶ء میں مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مرحوم نئی دہلی تشریف لائے اور ایک دعوت میں ایک شخص نے پوچھا کہ حضرت پاکستان اب بننے والا ہے اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ سید صاحب نے فرمایا آپ کو مبارک ہو کہ ایک اسلامی ملک اور اسلامی سلطنت کا مطالبہ آپ نے کیا ہے اور وہ عنقریب پورا ہونے والا ہے۔ لیکن پاکستان کے بنانے میں ایسا خطرناک کھیل کھیلا ہے جس سے مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔ ہمارے کان کھڑے ہوئے ایک تجربہ کار بزرگ نے اس کو خطرناک کھیل کہا ہے میں نے پوچھا حضرت وہ خطرناک کھیل کیا ہے؟ فرمایا دنیا میں جب بھی کوئی ملکی انقلاب آتا ہے تو قوم میں پہلے ذہنی انقلاب لایا جاتا ہے پھر ملکی انقلاب آتا ہے اور یہی صحیح طریقہ ہے اسلام نے اسی طریقہ کو اختیار کیا ہے۔

سید صاحب نے فرمایا کہ آپ نے پاکستان تو بنالیا ہے لیکن پاکستان کے لئے صحیح ذہن پیدا نہیں کیا سب سے پہلا کام آپ کو یہ کرنا ہوگا کہ آپ کو قوم کی ذہنی تربیت کرنی ہوگی اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو مجھے خطرہ ہے کہ کہیں پاکستان کو نقصان نہ پہنچے آج ان کی بات سامنے آرہی ہے وہی مسلمان جو پاکستان بنانے کے لئے سربکف تھے آج ۲۳ سال کے بعد ان کی حالت کچھ ایسی ہوگئی ہے کہ پہچانی نہیں جاتی۔

پاکستان کی نئی نسل کو پاکستان کے پس منظر کا علم نہیں ہے اس نے انگریزوں اور ہندوؤں کا ظلم نہیں دیکھا۔ آج مزدوروں اور کسانوں کو طرح طرح کا لالچ دیا جارہا ہے کہ انہیں فلاں کارخانہ دے دیا جائے گا فلاں زمین دے دی جائے گی ان کو تو خیر پھر بھی کوئی لالچ دیا جارہا ہے لیکن معلوم نہیں طالب علم سوشلزم کا نام سن کر کیوں رقص کرنے لگ جاتے ہیں؟

میں ماضی پر تھوڑی سی روشنی ڈالنا چاہتا ہوں انگریزوں نے حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی بنیوں کے ہاتھ سے نہیں چھینی تھی اس وجہ سے انگریز نے مسلمانوں کو تعلیم اور معاش میں پیچھے رکھنے کی پوری کوشش کی تاکہ اس میں دوبارہ حکومت حاصل کرنے کی امنگ پیدا نہ ہو اس کے مقابلے میں ہندو قوم صدیوں سے غلام چلی آرہی تھی اور اس میں حکومت حاصل کرنے کے جراثیم ہی نہیں تھے۔ لہٰذا انگریز نے اسے خوب چڑھایا اور ہر میدان میں اسے آگے بڑھانے

کی کوشش کی۔ چنانچہ جب مسلمانوں نے انگریز کے خلاف تحریک آزادی جاری کی تو گاندھی جس کے دل میں اپنی قوم کا بہت درد تھا اس نے بھی ہندو قوم کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔

یہ وہ موقع تھا جب گاندھی جی نے حکیم اجمل خان صاحب سے کہا کہ اس تحریک میں جان ڈالنے کے لئے علماء حضرات کو بھی میدان میں لانا چاہیے چنانچہ ہر تحریک میں جان ڈالنے کے لئے علماء کو ڈھونڈا جاتا ہے بعض لوگ مکہ میں مل جاتے ہیں بعض کسی اور جگہ مل جاتے ہیں۔

چنانچہ حکیم اجمل خان اور مولانا محمد علی جوہر کی معیت میں گاندھی جی حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیریؒ کے پاس پہنچے، گاندھی جی نے ان کے سامنے قرآن حکیم اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت تعریفیں کیں کہ وہ ایسے تھے وہ ایسے تھے۔

مولانا محمد علی صاحب مونگیریؒ نے فرمایا گاندھی جی آپ نے جو ہمارے قرآن اور ہمارے نبی کی تعریف کی ہے۔ ہمارے پیغمبر اور ہماری کتاب اس سے بہت اونچی ہے لیکن آپ نے ان میں عیب کونسا دیکھا ہے جس کی وجہ سے آپ ابھی تک ایمان نہیں لائے گاندھی جی بغلیں جھانکنے لگے اور ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

مولانا نے فرمایا گاندھی جی صیاد جب باغ میں پرندوں کو شکار کرتا ہے تو انہیں پھانسنے کے لئے انہی کی بولی بولتا ہے چنانچہ آپ بھی مسلمانوں کو پھانسنے کے لئے انہی کی بولی بول رہے ہیں۔ گاندھی جی بے نیل مرام واپس لوٹے اور انہیں اپنے مقصد میں کوئی کامیابی نہ ہوئی۔

ایک وہ زمانہ تھا کہ سیاست کی زمام کار مسلمان کے ہاتھ میں تھی اور ہندو ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا لیکن گاندھی جی نے کہنیاں مار مار کر مسلمان کو پیچھے دھکیل دیا اور جب انگریز کے جانے کا وقت آیا تو پتہ چلا کہ سیاست کا جھنڈا ہندو کے ہاتھ میں ہے مسلمان کے ہاتھ میں نہیں ہے اب ہندوستان کے ۱۰ کروڑ مسلمانوں کے مستقبل کا سوال تھا کہ انگریز کے چلے جانے کے بعد کسی ہندو کی غلامی کا پٹہ مسلمان کے گلے میں نہ پڑ جائے۔ کیونکہ ملازمتوں اور تعلیم میں ہندو آگے تھا۔ سیاست اس کے ہاتھ میں تھی تجارت اس کے ہاتھ میں تھی۔ وسائل معیشت اس کے ہاتھ میں تھی۔ لہٰذا خطرہ تھا کہ انگریز کے جانے کے بعد ۱۰ کروڑ مسلمان ۳۰ کروڑ ہندوؤں کے غلام نہ بن جائیں

چنانچہ فکر لاحق ہوئی کہ مسلمان کے مستقبل کے لئے کیا کیا جائے اس کے دو فارمولے تھے۔

ایک فارمولا تو یہ تھا کہ صوبوں میں اکثریت واقلیت کی بناء پر حکومتیں بنیں اور مرکز میں مخلوط حکومت ہو لیکن قائداعظم کی بصیرت نے یہ تاڑ لیا کہ یہ فارمولا ایک نہ ایک دن مسلمانوں کو غلام بنا کر چھوڑے گا۔ کیونکہ اس کے ساتھ ہی متحدہ قومیت کا نعرہ لگایا گیا ہے اور قوم کو مذہب کی بنیاد پر نہیں بلکہ وطن کی بنیاد پر مانا گیا۔

چنانچہ قائداعظم نے کہا کہ ہم اکثریت واقلیت کی بنیاد پر حکومت نہیں بنانا چاہتے بلکہ قرآن وسنت کی بنیاد پر حکومت بنانا چاہتے ہیں۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ صاحب یہ پاکستان اسلام کے لئے نہیں بنا تھا بلکہ سوشلزم کے لئے بنا تھا۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ اگر مقصد سوشلزم ہی تھا تو پھر ہندوستان کے سب سے بڑے سوشلسٹ پنڈت جواہر لعل نہرو کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہوتی پھر آپ لاکھوں انسانوں کی جانوں اور ہزاروں عورتوں کی عصمت سے کیوں کھیلے تھے؟

پاکستان کا فارمولا بالکل صحیح تھا لیکن افسوس یہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد نوکر شاہی نے ہمارے اس جذبہ کو بالکل نیست و نابود کر دیا پاکستان اسلامی قومیت کی بنیادوں پر بنا تھا لیکن آج ان بنیادوں کو بھی ملیامیٹ کر دیا گیا ہے یہی سرکاری ملازمین گھروں سے کاغذ قلم، دوات اور میز کرسی دفتروں میں لا کر کام کرتے تھے لیکن آج وہ وقت ہے کہ سرکاری ملازمین کو جو کچھ دفتروں میں ہاتھ لگتا ہے اٹھا کر گھر لے جاتے ہیں۔

۴۶ء میں عبوری حکومت میں جو بجٹ خان لیاقت علی خان نے پیش کیا وہ قرآن پاک کی اس آیت سے شروع ہوا۔

کی لا یکون دولة بین الاغنیاء منکم.

تا کہ دولت امیروں کے ہاں ہی چکر نہ کاٹتی رہی۔

اس آیت سے بتایا گیا تھا کہ پاکستان میں جو نظام قائم ہوگا وہ سرمایہ دارانہ نظام نہیں ہوگا بلکہ اسلامی نظام ہوگا لیکن سرکاری ملازمین نے سرمایہ دارانہ نظام ملک میں اس بدتمیزی سے چلایا کہ انگریز نے بھی اسی طرح نہیں چلایا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی ۸۰ فیصد دولت ۲۲

خاندانوں میں منحصر ہو کر رہ گئی کیونکہ جب تاجر اور ارباب اقتدار کا گٹھ جوڑ ہو جاتا ہے تو سرمایہ دارانہ نظام وجود میں آتا ہے حاکم کہتا ہے کہ میں پرمٹوں اور لائیسنسوں کے ذریعہ تمہاری تجارت کی حفاظت کروں گا تم اپنی دولت سے ہماری کرسی کی حفاظت کرو اور اسی طرح جب ارباب سیاست اور ارباب اقتدار کا گٹھ جوڑ ہو جاتا ہے تو سوشلزم کا نظام جنم لیتا ہے۔

ہم صاف کہتے ہیں کہ پاکستان کے حکمرانوں نے جب امریکہ سے دوستی کی اس وقت بھی ہمارے ایمان اور عقیدے کا سودا کیا تھا اور اب جبکہ انہوں نے چین سے دوستی کی ہے اب بھی ہمارے عقیدے کا سودا کیا ہے۔

اس کے بعد مولانا نے اشترا کی لٹریچر کی پاکستان میں درآمد پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور اس پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ کیا۔

آخر میں مولانا تھانوی نے کچھ سوالات کے جوابات دیئے اور شورش کاشمیری پر حملہ کرنے والوں کے لئے قرارداد مذمت پاس کی اور رات پونے دو بجے یہ اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

کیونکہ سیاست دان کہتا ہے کہ تاجر نے تمہیں کیا دیا ہے میں ''قومیانے'' کے حربہ سے سارے ملک کی دولت تمہارے قدموں میں ڈال دوں گا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام سوشلسٹ لیڈر نوکر شاہی کی پیداوار ہیں۔

لیاقت علی کی موت کے بعد ملک کے داخلہ وخارجہ دونوں وزارتیں نوکر شاہی کے ہاتھ میں آ گئیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ کیا ہم باہر کے ملکوں سے دوستانہ تعلقات قائم نہ کریں ہم کہتے ہیں ضرور کریں لیکن آپ ایسی دوستی قائم کریں جیسی ایک مولوی مولوی سے کرتا ہے۔ ایسی نہ کریں جیسی ایک مسٹر مسٹر سے دوستی کرتا ہے مولوی کی دوستی مولوی سے مردان خانہ تک ہوتی ہے لیکن مسٹر کی دوستی مردان خانے سے پہلے زنان خانہ میں ہو جاتی ہے۔

کراچی میں ایک اہم خطاب

بسم اللّٰہِ الرَّحمٰن الرَّحیم.

اَلحمدُ لِلّٰہِ نَحمَدُہٗ وَنَستَعِینُہٗ وَنَستغفِرُہٗ وَنُؤمِنُ بہٖ وَنَتوَکَّلُ عَلَیہِ وَنعُوذُ باللّٰہِ مِن شُرُورِ اَنفُسِنَا وَمِن سَیِّاٰتِ اَعمَالِنَا مَن یَّھدِہِ اللّٰہُ فَلا مُضِلَّ لہ وَمَن یُّضلِلہُ فَلا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشھَدُ اَن لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحدَہٗ لا شَرِیکَ لَہٗ وَنَشھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَولَانَا مُحَمَّدًا عَبدُہٗ وَرَسُولُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیرِ خَلقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصحٰبِہٖ اَجمَعِینَ.

اَمَّا بَعدُ! فَاَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ.

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ.

کراچی میں ایک اہم خطاب

خطبہ ماثورہ کے بعد فرمایا۔

جناب مولانا قاضی عبدالرحمٰن صاحب، حضرات علماء کرام معزز حاضرین اور میری اسلامی بہنیں! آپ حضرات نے جس گرم جوشی اور محبت کے ساتھ سپاسنامہ یا محبت کا وہ تحفہ جو بطور لفظوں کی شکل آپ کی طرف سے پیش کیا گیا میں اس کے لئے صرف یہی نہیں کہ شکر گذار اور ممنون ہوں بلکہ اس کے کچھ اجزاء ایسے بھی ہیں کہ جن کی وجہ سے مجھے کچھ ندامت اور شرمندگی بھی محسوس ہوئی ہے اس لئے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ کی راہ میں قید و بند کی منزل سنت ہے انبیاء کرام اولیاء اللہ اور بزرگان دین کی اور حق تعالیٰ جس کو اس سعادت کے لئے منتخب فرماتے ہیں یہ اس کے لئے بڑی خوش بختی اور کامیابی کی بات ہے اور یہ سب اللہ ہی کا بہت بڑا فضل اور احسان ہے کہ دین کے لئے اظہار حق کی توفیق نصیب ہوئی یہاں مجھے ایک بات یاد آ گئی کہ ۱۹۵۶ء میں جب میں برما گیا تو تقریباً ایک ماہ قیام رہا اور وہاں کے لئے ایک مہینہ کی مدت بالکل کافی نہیں تھی اگر میں مجمع میں اس طرف کے کوئی صاحب ہوں تو انہیں یہ بات معلوم ہوگی کہ وہاں دین کا بڑا شوق ہے وہاں کے لوگ بڑی محبت سے پیش آئے اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ کا وطن تو چھوٹ ہی چکا ہے کیا اچھا ہو کہ آپ برما میں آ جائیں میں نے ان کو جواب دیا کہ بھائی بڑی قربانیوں اور بڑی محنت و کوشش کے بعد ایک اسلامی ملک قائم ہوا ہے گو ہم اس کی خدمت کے قابل نہیں ہیں لیکن جو کچھ دین کی خدمت ہم سے ہو سکتی ہے وہ ہم کر رہے ہیں اور ہمیں کرنی ہے اگر ہم اس ملک کو چھوڑ کر چلے آئیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم بھاگ آئے ہیں اور یہاں حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے وہ جملے بھی یاد آ گئے جو نئی دہلی میں تقسیم سے چند مہینے پہلے دوران گفتگو ارشاد فرمائے تھے میں نے ان سے پوچھا تھا کہ پاکستان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے فرمایا

ٹھیک ہے خدا کرے پاکستان بن جائے لیکن یاد رکھئے کہ آپ ایسی جگہ اور ایسی بنجر زمین میں پاکستان بنا رہے ہیں کہ اگر آپ لوگوں نے وہاں محنت نہ کی تو بڑا اندیشہ اور بڑا خطرہ ہے میں نے اس کی تفصیل پوچھی تو فرمایا کہ دنیا میں یہ ہوتا آیا ہے کہ ہمیشہ پہلے ذہنی انقلاب آتا ہے پھر ملکی انقلاب آتا ہے...... آپ لوگوں نے یہ کیا کہ پہلے ملکی انقلاب لے آئے ذہنی انقلاب اب آپ کو پیدا کرنا ہوگا اس لئے کہ بڑی سے بڑی نعمت بھی اگر کسی ایسے آدمی کے یا کسی قوم یا گروہ کے ہاتھ میں آجائے جو اس کی صحیح قدر و قیمت کو نہ سمجھتا ہو تو یاد رکھئے کہ وہ نعمت کبھی اس کے پاس باقی رہنے والی نہیں ذہن بھی اس کے مطابق بنائیے فرمانے لگے کہ جو کام پہلے کرنے کا تھا وہ آپ کو بعد میں کرنا پڑے گا بڑی محنت کی ضرورت ہے۔

یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی اور یہاں آکر حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شاگرد اور ان کے خادم کی حیثیت سے کاموں میں لگے رہے اور شیخ الاسلام سے سیکھا کہ یہاں پر دین کا کام کس طریقہ پر کرنا چاہیے حضرت شیخ الاسلام کی ایک مخصوص عادت اور ایک الگ روش تھی میں اس کی وضاحت بھی کرنا چاہتا ہوں ایک مرتبہ کراچی میں حضرت شیخ الاسلام کے قیام کے لئے کراچی میں ایک بنگلہ کا الاٹمنٹ ہوا اس لئے کہ شہید ملت لیاقت علی خان کی یہ خواہش تھی کہ مولانا کسی کے پاس قیام نہ کریں بلکہ الگ اپنے مکان میں رہیں ایک مکان الاٹ ہوگیا اتفاق سے اس مکان کی الاٹمنٹ میں کوئی قانونی دشواری تھی اس لئے وہ الاٹمنٹ کینسل ہوگیا مولانا کو کسی نے اطلاع دی کہ آپ کے بنگلہ کا الاٹمنٹ منسوخ ہوگیا جہاں یہ نیوٹاؤن کی جامع مسجد بنی ہوئی ہے یہ پہلے میدان تھا وہاں ایک جلسہ ہوا اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی ماشاءاللہ جب بولتے تو بہت خوب بولتے تھے مولانا نے فرمایا کہ جب بنگلوں کا الاٹمنٹ کینسل ہوسکتا ہے تو وزارتوں کے الاٹمنٹ بھی کینسل ہوسکتے ہیں اور اس زمانہ میں اخبارات کا گلا اس طرح گھٹا ہوا نہیں تھا جس طرح آج ہے اگلے دن اخبارات میں پہلے صفحہ پر موٹی موٹی سرخیوں کے ساتھ یہ بات آئی کہ مولانا شبیر احمد عثمانی نے فرمایا کہ وزارتوں کے الاٹمنٹ بھی کینسل ہوسکتے ہیں صبح

کو میں کسی کام سے لیاقت علی خان کے پاس گیا اخبارات سامنے میز پر پڑے ہوئے تھے کہنے لگے آپ نے یہ خبر دیکھی ہوگی میں نے کہا دیکھی کیا میں تو خود جلسہ میں موجود تھا اس پر کہنے لگے کہ اگر مولانا ہمیں اس سے بھی سخت باتیں کہیں تو ہم برا ماننے والے نہیں اس کی وجہ بھی انہوں نے بتائی کہنے لگے کہ ہمیں یقین ہے کہ اگر کہیں کل کو پبلک ہمیں جوتے مارنے لگے تو پھر بچانے والے بھی مولانا ہی ہوں گے آپ نے سمجھا؟ پھر انہوں نے کہا کہ مولانا اصل میں یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا دین قائم ہو جائے مولانا ہماری کرسی نہیں چھیننا چاہتے مولانا اصول چاہتے ہیں آپ حضرات کو مولانا کا یہ تاریخی جملہ بھی یاد ہوگا کہ مولوی حاکم بننا نہیں چاہتے بلکہ حاکموں کو تھوڑا سا مولوی بنانا چاہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اس زمانہ میں سب کو یہ یقین تھا کہ علماء کا ایک طبقہ ایسا ہے جس کا مقصد اور نصب العین خالصتہً اللہ کا دین ہے خالصتہً احکام اسلام قائم کرنا ہے نہ کرسی ان کا مقصد ہے نہ سیاسی توڑ جوڑ ان کا نصب العین نہ پارٹی بازی ان کا مشغلہ ہے نہ کسی خاص شخص سے ان کو واسطہ ہے لیکن وہ جانتے تھے کہ یہ سرزمین حاصل کی گئی ہے اللہ کے احکام کے لئے اس لئے خدا ہی کے احکام یہاں جاری ہوں گے مولانا عثمانی جب بیمار ہوئے تو لیاقت علی خان مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ میری یہ کوشش ہے کہ کسی طرح مولانا کی زندگی میں دستور بن جائے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا خیر خواہ عالم پاکستان کو شاید پھر نہ ملے میں آپ کو یہ بات اس لئے بتا رہا ہوں کہ پاکستان بنانے میں دو قسم کے عنصر شامل تھے ایک طبقہ تو وہ تھا جس کو منڈیوں کے اندر یہ نظر آتا تھا کہ ہم ہندوؤں اور دوسرے غیر مسلموں سے مقابلہ نہیں کر سکتے ہماری تجارت ثانوی درجہ کی ہے ہندو اصل تاجر ہیں یا وہ مسلمان باوجود دفتروں میں یہ محسوس کرتے تھے کہ دوسرے اور تیسرے درجہ کے عہدے ہمارے پاس ہیں اعلیٰ درجہ کے عہدے ہندوؤں یا غیر قوموں کے پاس ہیں غرض ایک طبقہ وہ تھا جو تجارتی منفعت کے لئے سیٹوں کے لئے ملازمتوں کے لئے وزارتوں کے لئے سمجھتا تھا کہ ایک ایسا ملک ہمیں ملنا چاہئے کہ جہاں ہمارا ہی عمل دخل ہو دوسرا طبقہ وہ تھا جو حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید کی تحریک سے

متعلق چلا آ رہا تھا کہ ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کی جائے یہاں اللہ کا دین غالب ہو، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی یا اس سے پہلے بزرگ مجاہدین سے متاثر ہو کر اس دور میں اللہ کے دین سے تعلق رکھنے والوں نے پاکستان کے لئے جدوجہد کی جس میں سب سے پہلا نام حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ملتا ہے حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی ؒ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی، حضرت مولانا محمد شفیع صاحب مفتی اعظم، حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب، پیر صاحب مانکی شریف وغیرہ حضرات علماء کرام پاکستان بنانے کے لئے جدوجہد کر رہے تھے ان کا مقصد ہے دین اسلام اور ایک طبقہ کا مقصد ہے سیٹیں اور ملازمت، حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی نے فرمایا کہ دیکھو پاکستان بننے والا ہے اور جس طبقہ کے ہاتھ میں اقتدار جانے والا ہے اس کو تبلیغ کرو ورنہ ان کے ہاتھوں میں کہیں اقتدار آ گیا تو یہ سب سے پہلے اپنے اقتدار کی تلوار اسلام پر چلائیں گے۔ اس کے لئے حضرت مولانا تھانوی علیہ الرحمۃ نے مجلس دعوۃ الحق قائم فرمائی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ ان لوگوں کو کسی طرح دین کی طرف لانے کی کوشش کی جائے دونوں طبقوں کا یہ فرق آپ کو اس سے نظر آئے گا کہ جب پاکستان کا شجرہ نسب بیان کیا جاتا ہے تو ایک طبقہ اس کا سلسلہ سر سید مرحوم سے ملاتا ہے اور دوسرا طبقہ اس کا شجرہ نسب بیان کرتا ہے تو حضرت شاہ اسماعیل شہید سے ملاتا ہے ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے اور مجھے بڑی خوشی ہے کہ ایک بہت بڑے سرکاری افسر نے ایک مرتبہ دوران گفتگو میں مجھ سے کہا کہ میں انگریزی میں ایک کتاب لکھ رہا ہوں جس کا موضوع یہ ہے کہ پاکستان سر سید کی تحریک سے نہیں بنا بلکہ حضرت شاہ اسماعیل شہید کی تحریک سے بنا ہے انہوں نے کہا کہ حقیقت یہی ہے۔

تو میرے دوستو! دونوں طبقے پاکستان بنانے میں مصروف ہیں ایک کے پیش نظر مادی منفعت ہے اور دیندار علماء کے طبقے کے پیش نظر اللہ کا دین اور اللہ کے احکام ہیں یہ بات اسی وقت ذہن میں آئی تھی کہ ایک وقت اسی سر زمین میں ایسا آنے والا ہے کہ ممکن ہے کہ مادی منفعت کو اپنا نصب العین بنانے والوں اور دین کو نصب العین بنانے والوں میں شاید کوئی

تصادم اور رسہ کشی ہو جائے تو تقسیم سے پہلے ہی اس کا اندیشہ تھا تقسیم سے پہلے کے الفاظ آپ لکھ لیجئے اور اس کی شہادت دینے کے لئے ایسے حضرات ابھی موجود ہیں جن کو میں ثبوت میں پیش کر سکتا ہوں مولانا شبیر علی صاحب تھانوی ناظم آباد میں مقیم ہیں اور شاید آج کل علیل ہیں تقسیم سے پہلے میں اور مولانا شبیر علی صاحب جمعہ کے دن نئی دہلی میں لیاقت علی خان مرحوم سے اسمبلی بلڈنگ میں جا کر ملے اور علماء کے سلسلہ میں کچھ باتیں ہوئیں لیاقت علی خان نے یہ بات کہی کہ مولانا ہم ایسے پاکستان کو لے کر کیا کریں گے جس میں اچھے اور اللہ والے علماء موجود نہ ہوں اور میں یہ بھی بتا دوں کہ یہ کس سلسلہ میں کہا؟ دراصل مولانا شبیر علی صاحب تھانوی نے یہ بات کہی تھی کہ آپ الیکشن تو جیت چکے ہیں اور جیتنے والا ذرا اچھی طرح بات نہیں کرتا اس لئے ہم ڈرتے ڈرتے آپ کے پاس آئے ہیں کہ شاید آپ علماء سے گفتگو کے لئے تیار نہ ہوں ہماری خواہش ہے کہ آپ حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے گفتگو کر لیں اس پر انہوں نے کہا کہ یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ ہم گفتگو کے لئے تیار نہیں ہوں گے اس موقعہ پر انہوں نے کہا کہ میں ایسے پاکستان کو کسی قابل نہیں سمجھتا جس میں علمائے دین موجود نہ ہوں میں سمجھتا ہوں کہ اس پاکستان کی تعمیر علماء دین ہی کے ہاتھوں ہوگی۔

جب قرارداد مقاصد پیش کرنے کا وقت آیا تو ایک صاحب جو پاکستان میں یہ کہتے کہتے مر گئے کہ یہاں اسلامی حکومت نہیں ہوگی ہم اس کے لئے گولی کھانے کو تیار ہیں ان سے کسی شخص نے یہ کہا کہ صاحب ایسا کونسا بیوقوف ہے جو اپنی گولی کے پیسے آپ پر خرچ کرے گا اسد ملتانی مرحوم نے ایک بہت اچھا شعر کہا تھا اور وہ میدان حشر میں بھی ان کو سنایا جائے گا وہ شعر یہ ہے

حکومت کا آئین دینی نہ ہو گا   یہ کیا کہہ رہا ہے غلام محمد

نام بھی دیکھئے اور کام بھی دیکھئے وہ صاحب مولانا شبیر احمد عثمانی کے پاس تشریف لائے اور یہ کہا کہ مولانا قرارداد مقاصد کے لئے کوشش نہ کریں اس لئے کہ جو یہاں انگریزی دان طبقہ ہے وہ دین سے بھاگتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ علماء سے متنفر اور بیزار ہو جائے اور کہنے لگے کہ تاریخ کا واقعہ آپ اٹھا کر دیکھئے کہ اسپین میں کیا ہوا؟ مسلمانوں اور علماء کی شدت کی وجہ سے مسلمانوں کا قتل عام ہو گیا کہیں ایسا نہ ہو کہ یہاں بھی اسپین ہی کی تاریخ دہرائی

جائے اس پر مولانا عثمانی نے ارشاد فرمایا کہ آپ کے ذہن میں اسپین کی مثال ہے اور ہمارے ذہن میں افغانستان کی مثال ہے جب دین کی مخالفت کی تو امان اللہ خان کو تخت چھوڑ کر بھاگنا پڑا اور فرمایا کہ ہم تو دین کی جدوجہد جاری رکھیں گے دیکھتے ہیں کہ اسپین کی مثال سامنے آتی ہے یا ان کی طرح آپ کو بھاگنا پڑتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ چشمک اس وقت شروع ہوگئی تھی لیکن لوگ بڑے ہوشیار ہوتے ہیں جیسے کسی گھر میں چوری ہو اور گھر والوں کی آنکھ کھل جائے تو پھر چور بھی ایسا ہی کرتا ہے کہ آواز میں آواز ملا کر خود بھی چلانے لگتا ہے کہ دیکھنا پکڑنا چور کہاں گیا چور کہاں گیا یہ اس لئے ہوتا ہے کہ کوئی شبہ نہ کرے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ایک صاحب امپورٹ کئے گئے اور وزیراعظم بنا دیئے گئے ان کے خلاف میں نے اخباروں میں بڑا شدید اور سخت قسم کا بیان دیا تھا۔ انہوں نے گورنر جنرل سے شکایت کی کہ ان کو جیل کا راستہ دکھانا چاہئے اصل میں یہ تجویز جو اتنے سالوں کے بعد آئی، چل تو بہت دنوں سے رہی تھی، گورنر جنرل نے ان وزیراعظم سے کہا کہ تم نے یہ کہا ہی کیوں کہ حکومت اسلامی نہیں ہوگی، یہاں تم یہی کہتے رہو کہ اسلامی ہوگی اسلامی ہوگی چاہے اسلام کو مٹاؤ مگر کہتے یہی رہو آپ نے دیکھا کہ قدم قدم پر اسلام کا نام ہے لیکن آپ یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ اسلام کے ساتھ رفتہ رفتہ کس قسم کا افسوسناک برتاؤ کیا جارہا ہے۔

دست گلچیں پھر رہا ہے شاخ گل پر بے دریغ
کون سنتا ہے چمن میں عندلیب زار کی

تو میرے دوستو! یہ چشمک شروع ہی سے ہوگئی تھی اور پھر ہماری روش شروع سے ہی رہی اور برابر اس کے لئے کوشش کرتے رہے کہ اس سرزمین پر اور اس ملک میں جو اسلام کے لئے حاصل کیا گیا تھا اسلام کے خلاف یہاں کوئی محاذ نہ بنے اس لئے کہ یہاں کسی عالم کا سوال نہیں ہے ایک احتشام الحق کیا اور پانچ علماء کیا میں کہتا ہوں کہ خدا کی قسم اگر پانچ ہزار علماء کو بھی آپ پھانسی پر چڑھا دیں لیکن پاکستان کے اندر خدا اور خدا کے رسول کا دین قائم ہو جائے تو میں کہتا ہوں کہ یہ سودا پھر بھی سستا ہے شخص کا تو کوئی سوال ہی نہیں سوال اصل میں اس کا ہے کہ کہیں

دشمنوں کے سامنے شرمندگی نہ ہواس لئے کہ لوگ یہ کہیں گے کہ جن لوگوں نے اسلام کے قائم کرنے کے لئے ملک بنایا تھا انہوں نے اس ملک میں اسلام کو دفن کر دیا ہمیں ہمیں اپنی گرفتاری کا کوئی صدمہ نہیں لیکن صدمہ ہمیں اس دن ہوتا ہے جس دن ہم بھارت کے ریڈیو سے پاکستان کے خلاف، اسلام کے خلاف اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ سنتے ہیں وہاں کے بعض علماء نے تقریریں کیں اور ہم کو چڑانے کے لئے کیں، انہوں نے کہا کہ بھارت سرکار کا مذہب اسلام کے ساتھ یہ رویہ ہے اور علماء کے ساتھ اس کا یہ رویہ ہے اور پاکستان کا رویہ دیکھئے کہ چاند کے مسئلہ میں ان علماء کو جیل میں ڈال دیا جو چلا چلا کر کہتے تھے کہ یہ اسلامی سلطنت ہے یہ جہاد ہے یہ ثواب ہے۔ آپ ایمان سے بتایئے کہ ہم کو اس سے تکلیف ہوئی یا نہیں؟

میرے دوستو! یاد رکھئے کہ ہم نے یہ ملک اللہ کے دین کے لئے حاصل کیا ہے ہمارا نہ کوئی ذاتی مقصد ہے نہ کسی پارٹی سے ہمارا مطلب ہے نہ کسی شخص واحد سے ہمارا تعلق ہے، خدا کی قسم میں اعلان کرتا ہوں کہ اگر ہمارا یہ دین صدر ایوب کے ہاتھوں قائم ہو جاتا ہے تو ہم انہی کو امیر المومنین سمجھ کر ان کی امامت میں نماز ادا کرنے کو تیار ہیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ گذارش بھی ہے کہ اگر کچھ لوگوں نے انہیں مشورہ دیا ہے کہ اللہ کے دین کو قائم کرنے والے علماء کو کسی نہ کسی طریقہ سے مٹا دیا جائے تو صاف بات یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی طاقت نہیں ہے ہم آپ کو کوئی دھمکی نہیں دیتے نہ ہم لوگوں سے یہ کہتے ہیں کہ تم اپنی کسی طاقت کا مظاہرہ کرو۔ لیکن میرے دوستو! اتنی بات تو ہم ضرور کہہ دیں گے کہ اگر ہم کچھ کر سکتے ہیں تو ہم اللہ کے دین پر بہر حال عمل کریں گے اور اگر اس میں جان دینے کی ضرورت پیش آئی تو انشاء اللہ جان بھی دیدیں گے آخر ہم نے پاکستان بنایا ہے ہمارے اکابر اور بزرگوں نے اس کے لئے قربانیاں دی ہیں۔ سالہا سال جیلوں میں رہے ہیں۔ تکلیفیں اور مشقتیں جھیلی ہیں۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت گنگوہیؒ، حضرت حافظ ضامن تھانویؒ، حضرت شیخ الہندؒ، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مفتی کفایت اللہ دہلویؒ اور ان کے بہت سے ساتھیوں نے

ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں سختیاں برداشت کی ہیں۔

میرے دوستو! ہمارے بزرگوں نے کوئی ڈیڑھ صدی پہلے دین کی خدمات کا سلسلہ شروع کیا تھا اور حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ نے سب سے پہلے ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی تھی ہمارے یہ بزرگ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بنفس نفیس شریک ہوئے تھے، حضرت حاجی امداداللہ صاحب سپہ سالار کی حیثیت سے جنگ لڑتے ہیں حضرت گنگوہیؒ، حضرت نانوتویؒ اور حضرت حافظ ضامن صاحب شہیدؒ بھی ساتھ تھے یہ حضرات انگریزوں کا تعاقب کرتے ہوئے کافی دور تک دوسرے قصبے تک پہنچ گئے انگریز ایک تحصیل کی عمارت میں بند ہوگئے تاکہ ہمیں کوئی کمک نہ پہنچ جائے حضرت حاجی صاحبؒ نے یہ مشورہ کیا تھا کہ اسی تحصیل پر حملہ کرکے ان انگریزوں کو یہاں سے ختم کرنا ہے حضرت حافظ ضامن صاحبؒ فرمانے لگے کہ حضرت! ان شاء اللہ یہ تحصیل تو صبح تک فتح ہوجائے گی لیکن ہم نہیں رہیں گے سب سے پہلے جو حملہ کیا ہے تو گولی حضرت حافظ صاحبؒ کو لگی اور وہ وہیں گر گئے اور شہید ہوگئے یہی وہ بزرگ ہیں جن کے بارے میں میں نے حضرت حکیم الامت تھانویؒ سے سنا ہے کہ کوئی شخص ان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گیا تو آواز آئی کہ جا کسی مردے کی قبر پر فاتحہ پڑھ، بہرحال ہمارے انہی بزرگوں نے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھا کر مسلمانوں کے عقائد اور دین اسلام کی حفاظت کی اور یہی وجہ ہے کہ آج جتنا دین ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں میں نظر آتا ہے اتنا دین اور کہیں نہیں ملے گا یہ ہمارے انہی اکابر علماء کی بدولت ہے جنہوں نے بوریاں اور چٹائیوں پر بیٹھ کر علم دین کی حفاظت کی ہے ہم نے اپنے انہی بزرگوں کی قائم کردہ درسگاہ دارالعلوم دیوبند سے علم حاصل کیا ہے اس درسگاہ کی خاصیت ہی یہی ہے الحمدللہ! مجھے بڑی خوشی ہے اس بات کی کہ حریت فکر اور حریت ضمیر اس درسگاہ کی سب سے بڑی خصوصیت ہے اور ہم انہی بزرگوں کے شاگرد ہیں۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب اسیر مالٹا کا ایک واقعہ مجھے یاد آیا کہ قبرستان میں کسی طالب علم کی تدفین کے لئے گئے تو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی قبر کے پاس

جگہ خالی تھی مولانا عزیز گل صاحب نے فرمایا کہ حضرت شیخ! آپ کے لئے یہ جگہ زیادہ موزوں ہے آپ اس کو اپنے لئے محفوظ کرا لیجئے لوگوں کو تو یہ بات ناگوار گذری مگر حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ یہ تو آپ کی خواہش ہے کہ میں یہ جگہ اپنے لئے محفوظ کرا لوں مجھ سے تو پوچھئے کہ میری کیا خواہش ہے؟ فرمانے لگے میری تو یہ خواہش ہے کہ میدان جہاد میں اس طریقہ پر مارا جاؤں کہ ہاتھ میرا کہیں کٹا پڑا ہو سر کہیں کٹا پڑا ہو پاؤں کہیں کٹے پڑے ہوں اور فرمایا کہ میں تو اصل میں چاہتا ہی نہیں کہ کسی جگہ میری قبر کا نشان بھی ہو تو میرے دوستو! الحمدللہ ہم ان اکابر اور بزرگوں کا نام لینے والے ہیں۔

یہ کھیل دل کے لینے کے جو کھیلتے ہیں آپ
مجھ سے نہ کھیلئے کسی ناداں سے کھیلئے

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پاکستان کے اندر اسلام کا بول بالا فرمائے اور اللہ تعالیٰ احکام اسلام کو پاکستان کے اندر سربلندی عطا فرمائیں اور اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو پاکستان کے استحکام کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

(ماخوذ از کتاب ''کلمۃ الحق'' مطبوعہ۔ کراچی)

نظام اسلام اور مسئلہ کشمیر کے متعلق تاریخی خطاب

اَلحمدُ لِلّٰہِ نَحمَدُہٗ وَنستَعِینُہٗ وَنستَغفِرُہٗ وَنُؤمِنُ بِہٖ وَنتَوَکَّلُ عَلَیہِ وَنعُوذُ بِاللّٰہِ مِن شُرُورِ انفُسِنَا وَمِن سَیِّاٰتِ اَعمَالِنَا مَن یَّھدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضلِلہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنشھَدُ اَن لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحدَہٗ لَا شَرِیکَ لَہٗ وَنَشھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَولَانَا مُحَمَّدًا عَبدُہٗ وَرَسُولُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیرِ خَلقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصحٰبِہٖ اَجمَعِینَ۔

اَمَّا بَعدُ! فَاَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ۔

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ۔

نظام اسلام اور مسئلہ کشمیر کے متعلق مولانا کا تاریخی خطاب

مسئلہ کشمیر کا حل صرف اسلامی نظام سے وابستہ ہے

مرکزی جمعیت علماء اسلام پاکستان کے ترجمان صوت الاسلام لاہور کے اجراء کے موقع پر افتتاحی خطاب

اس وقت کم وبیش تمام مسلمان ملکوں میں سوشلزم، اسلامی سوشلزم اور اسلامی نظام کی بحث چلی ہوئی ہے۔ ہمارے وطن عزیز میں بھی یہ بات زیر بحث ہے کہ ملک کا دستور اور نظام حیات کیا ہونا چاہئے؟ اسلام یا سوشلزم؟

اس مجلس میں نہ ہم سوشلزم پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں اور نہ اسلام اور سوشلزم کا تقابلی مطالعہ مقصود ہے۔ صوت الاسلام شمارہ مرکزی جمعیت علمائے اسلام کے ترجمان کی حیثیت سے جلوہ فگن ہو رہا ہے۔ جمعیت علمائے اسلام کے بانی اور اولین صدر مولانا شبیر احمد عثمانی ہیں۔ اس وقت میرے سامنے علامہ عثمانی مرحوم کا ایک تاریخی خطبہ صدارت ہے جو آپ نے ۴ مارچ ۱۹۴۹ء کو ڈھاکہ میں جمعیۃ علمائے اسلام کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں ارشاد فرمایا۔

علامہ عثمانی جس جمعیۃ کے بانی اور صدر اول تھے۔ یہ رسالہ صوت الاسلام اسی جمعیت کا ترجمان ہے۔ اسی مناسبت سے تعلق کے پیش نظر علامہ مرحوم کے خطبہ صدارت ڈھاکہ سے

چند ایسے اقتباسات عرض کر رہا ہوں جن میں علامہ مرحوم نے پاکستان میں اسلامی نظام کی اہمیت اور اسلامی نظام کے خلاف ابھرنے والے فتنوں کی نشان دہی کی ہے۔

مولانا مرحوم کے فکر و تدبر اور سیاسی بصیرت پر ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انہوں نے آج سے اکیس برس پہلے ان فتنوں اور سازشوں سے قوم کو آگاہ کر دیا تھا جو آج ہمیں اور ہمارے وطن عزیز کو درپیش ہیں۔

سب سے پہلے مولانا کی زبانی قیام پاکستان کا مقصد سنیئے کہ وہ کیا تھا؟ مولانا کہتے ہیں۔

''قیام پاکستان کا اصل مقصد اور اس کی دو قسطیں''

''بحمد اللہ اب ایک ایسا خطہ ارض مل گیا ہے جہاں مسلم قوم کو یہ قدرت و تمکنت حاصل ہے کہ وہ وہاں تمام تر اسلامی آئین و قانون نافذ کرنا چاہیں تو دنیا کی کوئی طاقت انہیں روک نہیں سکتی۔ یہی مکمل آزادی کی وہ قسط اول، پہلی منزل اور بنیادی حقیقت ہے جس کا حصول اکھنڈ ہندوستان میں ممکن نہ تھا اور جس کی حفاظت ہر قیمت پر اہل پاکستان کے ذمہ واجب ہے۔

آگے قسط ثانی اور دوسری منزل یہ ہے کہ ہم سب مل کر اس مملکت میں اللہ تعالیٰ کی تشریعی حکومت قائم کرنے کی سعی کریں۔ جس طرح اس کی تکوینی حکومت سارے عالم پر قائم ہے۔ ہماری حکمرانی کے بھی وہی طور وطریق ہوں جو ابوبکرؓ و عمرؓ کی حکومت کے تھے۔''

قیام پاکستان کا یہ بنیادی مقصد بیان کرنے کے بعد مولانا ان خطرات اور اندیشوں کا احساس کرتے ہوئے جو آج ہمیں درپیش ہیں فرماتے ہیں۔

''اگر اپنی غفلت اور لاپرواہی سے ہم ایسا نہ کر سکے اور پہلے ہی منزل میں اٹک کر رہ گئے تو یہ ہماری بدبختی، حرماں اور حاصل شدہ آزادی کی نعمت عظمیٰ کا انتہائی کفران ہوگا۔ اور اگر دوسری قسط وصول کرنے سے پہلے خدا نہ کرے وہ پہلی قسط سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے تو یہ اس سے بھی بڑی حماقت اور بدنصیبی ہوگی، جس کیلئے ہم ہمیشہ آنے والی تاریخ کے سامنے جواب دہ رہیں گے۔''

صرف یہی نہیں کہ مولانا اکیس برس پہلے قوم کو ایک عظیم اور ہمہ گیر خطرے سے آگاہ کر رہے ہیں۔ بلکہ خطرہ کی آگاہی اور نشاندہی کے ساتھ ساتھ اس کا حل بھی بتاتے ہیں۔

''سب جانتے ہیں کہ محولہ بالا بحر حوادث کی طوفانی لہروں کو ہم نے محض خدا، قرآن اور اسلام کا نام لے کر عبور کیا تھا۔ اب سمجھنا چاہیے کہ جس چیز کا محض نام لینے سے ہم کو اتنی کامیابی ہوئی، اگر واقعی ہم اس کے تقاضوں پر عمل پیرا ہو جائیں تو کیا فتح و نصرت ہمیں خداوند قدوس کی طرف سے حاصل نہ ہوگی؟''

مولانا قوم سے سوال کرتے ہیں کہ تم نے جس نام اور جس بنیاد پر یہ ملک حاصل کیا تھا۔ اگر تم اس نام کو باقی اور اس بنیاد کو قائم نہ رکھ سکے تو بتاؤ قوت و طاقت کا سر چشمہ کہاں سے لاؤ گے جو صرف اس نام اور بنیاد میں پنہاں ہے اور جس کے بغیر تمہاری بقاء تمہاری زندگی اور تمہاری آزادی محض ایک ریت کی دیوار اور مٹی کا گھروندہ ہے، جو ہوا کے ہر جھونکے اور تھپیڑے کے سامنے سرنگوں ہونے اور ہر وقت ٹوٹنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ مولانا پوچھتے ہیں۔

''آخر قرآن سے منہ موڑ کر ہم کونسا نظام حیات اور آئین حکومت اختیار کریں گے حالانکہ کہ قرآن ہی وہ مکمل لازوال ابدی اور عالم گیر نظام نامہ صداقت ہے۔ جس سے ہر شعبہ زندگی میں ہم نور اور قوت کا اکتساب کر سکتے ہیں۔''

مسلمانوں کے مصائب کا علاج صرف قرآنی نظام میں ہے

آج مسلمان انڈونیشیا سے لے کر عالم عرب تک ہر جگہ طاغوتی طاقتوں کے نرغے میں ہے۔ کبھی انڈونیشیا میں کمیونسٹوں کی سازشیں خون خرابہ کا باعث بن رہی ہیں کبھی فلسطین میں یہودیوں کی سازشوں نے عربوں کو موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا کیا ہوا ہے مسلمانوں کا قبلہ اول دنیا کی سب سے بڑی سرمایہ پرست اور سرمایہ داروں کی سب سے بڑی مخالف حکومتوں کی گندم، بدبودار اور منافقانہ سیاست کے نرغے میں ہے۔ ہندو سامراج کی غاصبانہ چیرہ دستیاں پاکستان کے گرد فوجی حصار قائم کرنے کی فکر میں ہیں۔ بھارت کے چھ کروڑ مظلوم و بے بس مسلمان خوف و ہراس کے سکرات میں مبتلا ہیں اور ظلم و تشدد کا ہاتھ ان کے دروازوں پر دستک دے رہا ہے، ان سب مصائب اور عالمگیر مشکلات کا کیا حل ہے؟ لیجیے مولانا مرحوم کی زبانی سنیئے۔

''ان تمام مشکلات سے نمٹنے کے لیے ہم اور سارا عالم اسلام مختلف قسم کی تدابیر پر غور کر

رہا ہے۔ ہر ذی رائے مسلمان اپنی اپنی جگہ الگ الگ نقطہ نظر سے سوچتا ہے اور تجویزیں تیار کرتا ہے لیکن صد افسوس کہ مسلم ہونے کی حیثیت سے یہ توفیق بہت ہی کم ہوتی ہیں کہ قرآن کریم سے اپنی مشکلات کا کوئی حل معلوم کریں۔ ہماری نگاہیں کبھی برطانیہ، کبھی امریکہ اور کبھی روس کی طرف اٹھتی ہیں۔ اگر نہیں اٹھتیں تو اس نور مبین کی طرف نہیں اٹھتیں، جو ہماری دائمی رہنمائی کے لیے رب عظیم کی طرف سے ہمیں مرحمت ہوا تھا۔''

مسلمانوں کی فتح وشکست کا معیار کیا ہے؟

ہمارے لیے یہ حقیقت نا قابل انکار ہے کہ ہم کسی بھی مرحلہ پر اپنے دشمن پر نہ عددی برتری حاصل کر سکتے ہیں اور نہ ظاہری و مادی اسباب و وسائل کی فراوانی میں اس کے ہم پلہ ہو سکتے ہیں مولانا مرحوم اس کا ایک اور صرف ایک ہی حل بتاتے ہیں اور وہ ہے اللہ کا راستہ، قرآن کا راستہ اور صبر وتقویٰ کا راستہ۔

'' قلت تعداد و اسباب کے باوجود ہمارے لیے اگر فتح و کامرانی کی صورت ہے تو اس کا مدار صرف قادر مطلق کی نصرت پر ہے اور یہ نصرت و امداد مسلمانوں کو صبر وتقویٰ کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے۔ قرآنی ارشاد ہے بے شک اگر تم صبر وتقویٰ اختیار کرو اور دشمن کو فوراً کمک پہنچ جائے تو اللہ پانچ ہزار فرشتوں سے تمہیں مدد پہنچائے گا۔''

۱۹۶۵ء میں جب ہم نے اپنی بقاء اور تحفظ کے لیے جہاد کیا اور باطل کی طاقت سے نبرآزما ہوئے تو ثابت ہو گیا کہ فتح وشکست کا مدار اسباب و ذرائع کی کثرت وقلت پر ہرگز نہیں اور کوئی بھی جنگ مہیب اور ہلاکت خیز ہتھیاروں کے بل بوتے پر نہیں جیتی جا سکتی۔ خود ہمارے جرنیل اس اعتراف پر مجبور ہوئے کہ ہم نے یہ جنگ ہرگز عددی برتری اور اسباب کی فراوانی کی بنیاد پر نہیں جیتی یہ جنگ مضبوط کیریکٹر، بہترین ڈسپلن، بلند حوصلے اور خدا پر بے اعتماد کی بدولت جیتی گئی ہے۔

پاکستان میں اسلامی نظام کی مخالفت ہندو کی گہری چال ہے

علامہ عثمانی مرحوم کی نگاہ دوررس نے حالات و واقعات کا کس کس حد تک تعاقب کیا اس کا اندازہ اس اقتباس سے لگائیے۔ جس میں مولانا پاکستان میں اسلامی نظام حیات کی مخالفت اور

اشتراکیت جیسے لادینی نظاموں کی سرپرستی اور نفاذ کی کوششوں کی کس وضاحت سے نشاندہی کرتے ہیں۔ اور آج حالات زبان حال سے یہ کہہ رہے ہیں اور ہماری آنکھیں مشاہدہ کر رہی ہیں کہ ہندو سامراج بائیس سال سے جب ہمیں جغرافیائی، معاشی، اقتصادی، صنعتی اور فوجی محاذوں پر سرنگوں نہ کر سکا تو اس نے ہماری نظریاتی سرحدوں کو مٹانے کی کوششیں کیں اور اپنے زعم باطل میں یہ جانا کہ شاید اس محاذ پر کامیابی ہو۔ مولانا فرماتے ہیں۔

"اس جگہ پاکستانی حکومت کو یہ نکتہ بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ نظام اسلامی کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے سے ہندو کا ایک گہرا مقصد یہ ہو سکتا ہے کہ اس طرح ارباب اقتدار کے دماغوں کو متاثر کر کے اور اسلامی آئین کی تجویز کو مسترد کر کے پاکستان کے مسلمانوں کو یہاں کی حکومت سے بیزار اور منقطع کر دے ادھر دفاع پاکستان کے سلسلہ میں مذہبیت کے اس بے پناہ جذبے کو ٹھنڈا کر دے جو مسلمانوں کے عمومی مزاج کے لحاظ سے پاکستان کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ گویا اس طرح ہندو، پاکستان کو ضعیف و کمزور بنانے کے لیے دوسری طرف سے حملہ کرنا چاہتا ہے۔

مسئلہ کشمیر کا حل اسلامی نظام میں مضمر ہے

علامہ شبیر احمد عثمانی نے فرمایا کہ کشمیر کا مسئلہ بھی صرف اسی صورت میں حل کیا جا سکتا ہے جب پاکستان میں اسلامی دستور کا نفاذ ہو، سوشلسٹ یا سیکولر اسٹیٹ بنا کر ہم کشمیر کا مسئلہ نہ حل کر سکتے ہیں، نہ اٹھا سکتے ہیں۔ لیجئے مولانا کی زبانی سنیئے۔

"ایک اور اہم ترین مسئلہ ہمارے سامنے کشمیر میں استصواب رائے عامہ کا مسئلہ ہے۔ اس میں کامیابی بھی بڑی حد تک میرے نزدیک اسی اعلان سے وابستہ ہے ورنہ بھارت کی حکومت اور علمائے ہند کی جانب سے بے حد زبردست پراپیگنڈہ ہوگا۔ اس کے جواب میں پاکستان کا پہلو بہت کمزور ہوگا۔

"اور اگر فرض کیجئے وہاں دوبارہ جنگ کی نوبت آ گئی جو غالباً کشمیر تک محدود نہ رہے گی تب بھی ہمارے دفاع کے لیے وہی مذہبی سپرٹ بہت زیادہ کام دے گی جو خدائی آئین اور اسلامی

نظام حکومت کے اعلان سے مسلمانوں میں پیدا ہو سکتی ہے۔ بہر کیف جس پہلو سے نظر کیجئے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہماری مملکت کی خوبی۔ تحفظ اور استحکام کا راز اسلامی نظام کے نفاذ میں پوشیدہ ہے اور یہ کہ جس نام پر پاکستان حاصل ہوا، اسی نام پر یہ مضبوطی کے ساتھ باقی رہے گا۔''

علامہ عثمانی کی نگاہ دوررس سولہ برس پیشتر کشمیر میں دوبارہ جنگ کے شعلے بھڑکتے دیکھ رہی تھی۔ ہمارے حکمرانوں نے تو وقت کے وقت تک یہی سمجھا کہ کشمیر میں لڑی جانے والی جنگ کے شعلے، کشمیر کی وادیوں سے باہر نہیں آئیں گے۔ مگر ستمبر ۱۹۶۵ء میں دنیا نے دیکھا کہ علامہ شبیر عثمانی نے سولہ برس پہلے جو بات کہی تھی وہ پوری ہوئی۔ کشمیر کی جنگ نے وسعت اختیار کی اور بین الاقوامی سرحدوں پر لڑی گئی اور پھر یہ مشاہدہ سب نے کیا کہ اس جنگ کو کس نے جیتا؟ افراد نے؟ ساز و سامان نے؟ ذرائع وسائل کی فراوانی نے؟ نہیں ان میں سے کسی نے نہیں، بلکہ ایک لازوال جذبے اور روحانی طاقت نے یہ جنگ جیتی اور پوری دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔

خوب سمجھ لیجئے، آج کا مسئلہ مسٹر و ملا کا مسئلہ نہیں، نہ یہ جدت و قدامت کی کشتی ہے اور نہ دیوبند، بریلی اور علی گڑھ کا اکھاڑہ ہے۔ یہ تو خدا کے بندوں کے لیے سخت ترین آزمائش کی گھڑی ہے کہ وہ اللہ کے دیئے ہوئے اس موقعہ سے کیا فائدہ اٹھاتے ہیں اور کس عزم و ہمت سے قرآنی آئین اور اسلام کے فطری اصول کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے کمر ہمت کستے ہیں۔

آخر میں علامہ مرحوم نے علماء سے اور نوجوانوں سے جو اپیل کی ہے وہ آج بھی اسی طرح نوائے تازہ ہے جیسے اس وقت تھی۔ اسی اپیل پر یہ تقریر ختم کرتا ہوں۔

علماء سے خطاب

''اے حضرات علمائے کرام! یہ آپ کا کام ہے کہ اسلام کی خاطر اپنے چھوٹے چھوٹے اختلافات سے کنارہ کش ہو کر مسلم قوم کو سنبھالنے اور سنوارنے کے لئے اتحاد اور یک جہتی کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ اور قوم کو اس قابل بناؤ کہ وہ نظام شریعت کو اپنا نظام زندگی بنالے، تعطل، جمود اور بطالت کو چھوڑ دو۔ عمل صالح کے ہر میدان میں نکلو خدا ہماری مدد کرے گا۔''

نوجوانوں سے خطاب

''میرے عزیز نوجوانو! وقت ہے کہ تم ہمت اور اولوالعزمی دکھاؤ۔ دریائے الحاد کے دھارے کے خلاف اگر تیرنا پڑے تو شیر ببر کی طرح سینہ سپر ہو جاؤ اور گمراہوں کے فریب میں مت آؤ جو تم کو پھر اسی الحاد میں دھکیلنا چاہتے ہیں، جن سے نکلنے کے لیے تم تحریک پاکستان کے وقت ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ بے دینوں اور نفس پرستوں کی تقلید کوئی قابل فخر نہیں خدائی نظام کا احیاء تاریخ میں تمہارا نظام روشن کر دے گا، اللہ اور اس کے رسول کے سامنے سرخرو بنائے گا، یاد رکھو! خدا کا دیا ہوا یہ موقعہ بھی اگر ہاتھ سے کھو دیا تو دنیا و آخرت کی تباہی سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔

من آنچہ شرط بلاغ است باتومی گویم!
تو خواہ از سخنم پند بگیر یا کہ ملال''

راولپنڈی کے جلسہ عام میں مولانا کا خطاب

(مختصر خلاصہ)

''اسلام سے انحراف کر کے پاکستان کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ جو لوگ یہاں سے اسلام کو نکالنا چاہتے، وہ دراصل پاکستان کی روح سے ناآشنا ہیں پاکستان اسی نام پر بنا تھا۔ یہی نام اس کی بقاء اور اس کے استحکام کا ضامن ہے۔''

مولانا نے فرمایا کہ اسلام سے بغض رکھنے والے لوگ اسلامی حکومت کے مطالبہ کو ملا کر حکومت کا نام دے کر یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ یہ کوئی ایسی حکومت ہوگی جس میں صرف ملا ہی ملا حکمران ہوں گے اول تو یہ ان لوگوں کی فکری عیاری ہے۔ دوم اسلامی حکومت کے مطالبہ کا یہ مفہوم کبھی نہیں رہا۔ سوم قائداعظم سے لے کر اب تک علماء کے کسی حصے نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ ملاؤں کی حکومت قائم کی جائے۔ اسلامی حکومت سے مراد ایسی حکومت ہے جو اسلام کی منشاء و غایت کے مطابق ہو۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ حکومت ہمارے ہاتھ میں آ جائے۔ ہم یہ

کہتے ہیں کہ حکمران ذرا مولوی بن جائیں۔ اور اوامر کو اوامر سمجھیں اور نواہی کو نواہی۔

مولانا نے فرمایا۔ ''یہ کسے معلوم نہیں کہ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی پارلیمنٹ اور دستوریہ کے رکن رہے، انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ لیاقت علی خان کی جگہ وہ یا کوئی اور مولوی وزیر اعظم بن جائے لیکن وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ نظام حکومت اسلامی ہو وہ لوگ جو آج قائداعظم سے منسوب کرتے ہیں کہ ان کے ذہن میں یہاں ایک سوشلسٹ حکومت کا قیام تھا۔ اول تو ان کی روایت محل نظر ہے، اس سے پہلے انہوں نے کبھی ایسی بات نہیں کہی دوم یہ بات انہیں آج سوجھی ہے۔ وہ اپنی خواہش میں قائداعظم کو بھی ملوث کرنا چاہتے ہیں۔

مولانا احتشام الحق نے فرمایا

''قائداعظم سے اسلامی آئین کے متعلق کسی نے کہا'' اسلام میں اختلافات ہیں'' انہوں نے فرمایا۔'' یہ غلط ہے۔ آئین وحکومت سے متعلق اسلام میں کوئی اختلاف نہیں۔ اختلاف صرف عبادات میں ہے اور وہ بھی اسلام میں نہیں، مسلمانوں میں ہے۔''

مولانا نے فرمایا'' ایک ملک کے لیے آئین کی جو بنیادیں لازم سمجھی گئی ہیں، وہ قرآن و حدیث میں موجود ہیں اور اگر ان کو یکجا کر کے آئین کے بنیادی خطوط وضع کر لیے جائیں تو کسی کو شکایت نہ ہوگی بلکہ ایک ایسا مثالی آئین ہوگا کہ اس پر کسی گوشے سے انگشت نمائی کا اندیشہ نہ ہوگا۔ حیرت ہوتی ہے کہ وہ لوگ اسلام پر اعتراض کرتے ہیں جو کہلاتے تو مسلمان ہیں لیکن مسلمان ہو کر بھی اسلام کے آئین سے واقف نہیں بلکہ انہیں اسلامی عقائد و نظام کے مبادیات کا بھی علم نہیں ہے۔''

مولانا نے فرمایا۔'' دولت کی منصفانہ تقسیم اسلام کی منشاء ہے۔ لیکن اس منشاء کو کسی ازم کے تابع نہیں کیا جا سکتا۔ جو لوگ یہاں بیرونی فلسفہ یا ازم کو لانا چاہتے ہیں وہ اس ملک کے اجتماعی ضمیر سے نابلد ہیں اور غلط فہمی کا شکار ہیں کہ یہاں وہ مسلمانوں کی ملت میں سے کسی ازم کی نسل پیدا کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ مولانا نے علماء کے باہمی اختلاف پر افسوس کیا اور فرمایا۔''ہم تحریک پاکستان کے سپاہی تھے۔ لیکن ہم ان سپاہیوں کی عزت کرتے ہیں

جنہوں نے برٹش امپریل ازم کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کیا اور غیر ملکیت غلامی کو ختم کرنے کا باعث ہوئے۔ اگر برطانوی ملوکیت کا خاتمہ نہ ہوتا تو پاکستان بھی نہ بنتا۔ یقیناً وہ لوگ ہمارے احترام کے مستحق ہیں، جو برٹش امپریل ازم سے لڑتے رہے حتیٰ کہ ان کی مساعی سے برطانوی استعمار اس ملک سے چلا گیا۔"

مولانا نے قائداعظم کو زبردست خراج پیش کیا کہ ان کی بدولت ہمیں یہ ملک ملا۔ اور افسوس کیا کہ ہم اس ملک کو اپنی سیاسی کبڈی کا میدان بنا رہے ہیں۔

مردان میں اسلامی نظام کے موضوع پر مولانا کا خطاب

مردان، مرکزی جمعیت علمائے اسلام کے قائد مولانا احتشام الحق تھانوی نے کہا ہے کہ پاکستانی عوام سوشلزم، کمیونزم اور نیشنل ازم کے خلاف متحد ہو چکے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں سوشلزم کا نعرہ بے اثر ہو چکا ہے۔ عوامی لیگ کے صدر شیخ مجیب الرحمان عوام کے دباؤ سے خوفزدہ ہو کر قرآن وسنت کے مطابق قانون بنانے کے حامی بن چکے ہیں۔ مگر جب تک وہ چھ نکاتی پروگرام سے دستبرداری کا اعلان نہیں کرتے ان کے نئے موقف پر یقین نہیں کیا جا سکتا انہوں نے کہا کہ چھ نکات کا مطلب پاکستان کا خاتمہ ہے۔ پاکستان ہی نہ رہا تو قرآن وسنت کے نظام کو کہاں نافذ کیا جائے۔ مولانا تھانوی نے یہ بات مردان میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہی انہوں نے پشاور منگورہ اور تیمر گرہ میں بھی جلسوں سے خطاب کیا۔

مولانا تھانوی نے کہا کہ نیشنل ازم پاکستان کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اس نعرے کا زیادہ زور مشرقی پاکستان میں تھا وہاں بنگلہ دیش کے نعرے کے بعد امرا باڑی تمرا باڑی نکسل باڑی کے نعرے بھی لگنے لگے تھے۔ مگر اب صورت حال کافی بدل چکی ہے۔ مشرقی پاکستان میں اب ایک نیا نعرہ "امر ستھان تمر ستھان" ہے شیخ مجیب الرحمان اس نعرے کی گونج سے خوفزدہ ہو کر قرآن وسنت کے مطابق قانون بنانے کے حامی بن چکے ہیں۔ لیکن جب تک وہ چھ نکات سے دستبردار نہیں ہوتے۔ ان پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا یہ نعرہ بھی دراصل سوشلسٹوں جیسا فریب ہے۔ انہوں نے کہا کہ لادینی نظام کی طرف بلانے والوں کے جلسوں میں سامعین کی تعداد کوئی

حقیقت نہیں رکھتی کیونکہ ان کے جلسوں اور جلوسوں پر بے تحاشا دولت خرچ کی جاتی ہے۔ اسلام میں کثرت کو کبھی حق کی دلیل نہیں سمجھا گیا۔ ہم تعداد میں تھوڑے ہونے کے باوجود حق پر قائم رہیں گے اور آخری فتح حق کو ہی حاصل ہوگی۔

مولانا تھانوی نے عوام کو خبردار کیا کہ وہ غریبوں کے نام نہاد خیر خواہوں کے فریب میں نہ آئیں۔ جن لوگوں نے کبھی روزے نہ رکھے ہوں۔ انہیں فاقہ کرنے والوں کی تکلیف کا احساس کیسے ہوسکتا ہے ایک دن بھی شراب کا ناغہ نہ کرنے والے غریبوں کے دردمند کیسے ہوسکتے ہیں انہوں نے کہا ہے کہ سوشلسٹ جماعتوں نے کروڑ پتیوں، زمینداروں اور سرمایہ داروں کو اسمبلیوں کے ٹکٹ دیئے ہیں۔ طبقاتی بنیاد پر انتخابات کا مطالبہ کرنے والوں نے غریبوں، کسانوں، مزدوروں کو ٹکٹ جاری نہیں کئے۔ غریبوں سے انہیں جو ہمدردیاں ہیں۔ وہ اسی بات سے ظاہر ہوگئی ہیں۔ مولانا تھانوی نے کہا کہ سی ایس پی افسروں نے بیس بائیس سال سے ملک میں سرمایہ دارانہ نظام جاری کر رکھا ہے۔ دولت و اقتدار چند خاندانوں میں محدود ہوکر رہ گیا ہے۔ آج صنعتوں کو قومیانے کا نعرہ وہی لوگ لگا رہے ہیں۔ جنہوں نے اپنے دور اقتدار میں ایک ایک سرمایہ دار کو بیس بیس کارخانوں کے لائسنس جاری کئے انہوں نے کہا کہ سرمایہ دارانہ نظام کی ذمہ داری آخر علماء پر کیوں ڈالی جاتی ہے علماء سوشلزم اور سرمایہ داری دونوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مولانا تھانوی نے تیمر گرہ میں جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آج پھر وہی حالات سامنے آ گئے ہیں جو پاکستان بننے سے پہلے تھے۔ پہلے ہمیں قیام پاکستان کے لئے جدوجہد کرنا پڑی اور آج پاکستان کی بقاء کی جنگ لڑی جا رہی ہے۔ ملک کی بقاء کا انحصار اسلامی نظام پر ہے بعض جماعتیں عوام کو مساوات کے نام پر بلا رہی ہیں۔ لیکن ہمیں ان کے فریب میں آنے کی بجائے اسلام کے نظام عدل کے لئے جدوجہد کرنی چاہیئے۔

قائد جمعیۃ حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی کے خطاب سے چند اقتباسات

صوبہ پنجاب کی مرکزی جمعیۃ علماء اسلام و نظام اسلام پارٹی کے عہدہ داروں کے انتخاب کے لئے مجلس شوریٰ کا اجلاس قائد جمعیۃ حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی کے زیر نگرانی بتاریخ ۱۶ اکتوبر جامعہ اشرفیہ لاہور میں منعقد ہوا۔ جس میں پنجاب کی تمام ضلعی شاخوں کے نمائندوں نے شرکت کی جس میں جناب حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی، حضرت مولانا عنایت اللہ شاہ بخاری، حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحب، حضرت مولانا فردوس علی شاہ صاحب قصوری، حضرت مولانا عبید اللہ صاحب مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور اور مولانا صاحب زادہ عبدالرحمٰن صاحب نائب مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

انتخاب سے قبل قائد جمعیۃ حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی نے رفقاء جمعیۃ کو خطاب کیا۔

رفقائے جمعیۃ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ مرکزی جمعیۃ علماء اسلام کے احیاء کو صرف ایک سال کی اتنی قلیل مدت ہوئی ہے جو تنظیمی اور جماعتی زندگی میں چشم زدن سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی مگر۔ اس وقفہ میں جو نمایاں خدمات آپ حضرات نے انجام دی ہیں وہ برس ہا برس کی خدمات سے بھی زیادہ ہیں۔

رفقائے جمعیۃ کو طریق کار سے متعلق ہدایت دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ اقامت دین کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اسلام کو صرف نصب العین بنانا کافی نہیں ہے جب تک اس کے حاصل کرنے کی کوشش اور تدبیر بھی احکام شرع کے مطابق نہ ہو کذب و افتراء مکر و فریب اور گالی گلوچ کے وہ ہتھکنڈے جن کو آج کل کی سیاست کی روح سمجھا جاتا ہے ممکن ہے کہ ان سے الیکشن جیتا جا سکتا ہو لیکن اسلامی نصب العین حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

ایک مسلمان کے لئے یہی اقامت دین ہے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں شریعت کے اوامر و نواہی کا پابند رہے۔

آج جو تنظیمیں اور جماعتیں ہمارے خلاف لادینی سیاست کے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کررہی ہیں ان کے دفاع اور جواب میں بھی ہمیں تہذیب وسنجیدگی اور دین ودیانت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔

ضلعی اور ذیلی شاخوں کی تنظیم کی ضرورت پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ جماعتوں اور انجمنوں کی تنظیم کے دو پہلو ہیں ایک تبلیغی دوسرا انتخابی۔

جہاں تک تبلیغی اور اصلاحی مقاصد سے متعلق تنظیم کا تعلق ہے وہ ہمارے اسلاف اور بزرگوں نے صدیوں سے تعلیم قرآن کے مکاتبت درس نظام کے مدارس اور مساجد کے خطباء کی صورت میں قائم کررکھی ہیں اور وہ اپنی جگہ نہایت موثر اور کامیاب ہے۔

البتہ انتخاب اور الیکشن کے لئے جس سیاسی تنظیم کی ضرورت ہے وہ اگرچہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہے مگر اہل باطل کے اقتدار سے بچنے کے لئے ناگزیر تنظیم ہے اور ہماری جماعت ابھی تک اس سلسلہ میں وقت کی کمی اور تبلیغی مصروفیات کی وجہ سے پوری طرح کام نہیں کرسکی۔ مجھے امید ہے کہ بہت جلد آپ حضرات کے ہاتھوں یہ کمی بھی پوری ہوجائے گی۔ نیز تنظیم سے متعلق یہ بھاری نکتہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ یہ تنظیم صرف الیکشن کے لئے نہیں ہے بلکہ اس کا اصل تعمیری کام الیکشن کے ہنگامے گذر جانے کے بعد شروع ہوگا۔ اگر خدانخواستہ لادینی قوتیں الیکشن میں برسر اقتدار آ گئیں تو ممکن ہے ہمیں ان کے خلاف تحریک چلانی پڑے گی اور قیدوبند کی مصائب سے دوچار ہونا پڑے۔

تنظیم میں ایسے فعال اور نڈر افراد کو شامل کرنا ضروری ہے جو قربانی کے وقت آتش نمرود میں بے دھڑک کود پڑنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

اسلام پسند جماعتوں کے مابین متحدہ محاذ کے بارے میں صورت حال کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا نے ارشاد فرمایا کہ۔

سوشلزم اور دوسرے لادینی نظاموں کے مقابلے میں جو نظریاتی جنگ لڑی جارہی ہے اس میں ذہنی اور فکری اعتبار سے اسلام پسند عناصر نے تقریباً فتح حاصل کرلی ہے لیکن الیکشن

اور انتخاب میں اگر اسلام پسند عناصر کا موثر متحدہ محاذ نہ بنا تو جیتی ہوئی جنگ کے ہار جانے کا زبردست خطرہ ہے اور معاملہ پاکستان کی بقاء اور عدم بقا کا اور اسلام وکفر کے اختیار کرنے کا ہے اس اہمیت کے پیش نظر ہم نے تقریباً اپریل ۷۰ء سے اس امر کی مسلسل کوشش کی کہ تمام اسلام پسند جماعتوں کا ایک انتخابی متحدہ پارلیمانی بورڈ بنا دیا جائے اور اس طرح اسلام پسند عناصر کے مابین کشمکش کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اس مہم کا آغاز ہم نے جماعت اسلامی کے سربراہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سے کیا تھا۔ افسوس ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی خاطر خواہ جواب نہ ہونے کی وجہ سے یہ مہم آگے نہ بڑھی پھر کراچی اور لاہور میں جون کے وسط اور اواخر میں اتحاد کے لئے مذاکرات شروع ہوئے جو شرکاء افراد کی بعض غیر ذمہ دارانہ باتوں کی وجہ سے بالآخر ناکام ہو گئے اس سلسلہ میں آٹھ جماعتوں کے اتحاد کا جو اعلان پریس میں آیا ہے اس کے بارے میں ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ موجودہ الیکشن اصل میں دستور سازی کے لئے ہے جس پر اسلامی نظام امور پاکستان کی بقاء کا دارومدار ہے دستور سازی کا مرحلہ اسلام پسند افراد کی غالب اکثریت کے بغیر طے کیا جا سکتا ہے اگر اعلیٰ کردار کے افراد چھوٹی اقلیت کی حیثیت سے دستور ساز اسمبلی میں آتے ہیں تو آیا لادینی عناصر کی اکثریت غیر اسلامی اور پاکستان کے خلاف دستور مرتب کرے گی اور یا ایک سو بیس دن کے بعد دستور تیار نہ ہونے کی شکل میں اسمبلی کو برخاست کر دیا جائے گا دونوں صورتیں اسلام اور ملکی حیثیت سے گوارا نہیں کی جا سکتیں اسلامی نظام کو قائم کرنے اور ملک کو بچانے کی صرف ایک ہی شکل ہے کہ اسلام پسند عناصر سوشلسٹ اور نیشنلسٹ طاقتوں کے خلاف اپنی اکثریت سے دستور مرتب کریں اور غالب اکثریت اس وقت تک نہیں حاصل ہو سکتی جب تک ملک کی ان تمام جماعتوں کو شامل نہ کیا جائے جو مشرقی اور مغربی پاکستان کے دونوں حصوں میں موجود ہیں اور جو بہر صورت معتد بہ تعداد میں کامیابی حاصل کریں گی۔

آٹھ جماعتوں کا اتحاد تبلیغی مقصد کے لئے مفید ہو سکتا ہے لیکن اس اتحاد سے پورے پاکستان کا یا مغربی پاکستان کا بلکہ پنجاب کا مسئلہ بھی حل نہیں ہوتا۔

آج تحریک استقلال اور مسلم لیگ کے دھڑوں کو شامل کر کے اتحاد کی کوئی شکل سامنے آتی ہے تو ہم سب سے پہلے اس اتحاد کو لبیک کہیں گے اور ہمارے نزدیک یہی طریقہ اسلام اور ملک کی بقا کے لئے صحیح طریقہ ہے۔

اس کے باوجود ہم آپ کو ہدایت کرتے ہیں کہ اتحاد میں شامل نہ ہونے کا مقصد آپس میں ایک دوسرے کی مخالفت کرنا نہیں ہے اور اس سے پورے طور پر گریز کرنا چاہئے۔

(صوت الاسلام لاہور)

اسلام پسند عناصر کے اتحاد میں ناکامی کے اسباب

اسلامی دستور کی تدوین میں اسے پاس کرانے میں اور اسلامی نظام حیات کو بروئے کار لانے کی جدوجہد میں مختلف جماعتوں اور افراد کا کردار کیا رہا ہے اور اس مقصد میں ناکامی کے عوامل کیا تھے۔ یہ پاکستان کی دستوری وسیاسی تاریخ کا نہایت اہم باب ہے اور ابھی تک پردہ خفا میں ہے۔ اگر زندگی نے مہلت دی تو ان شاءاللہ ضرور قلم بند کیا جائے گا۔

اس وقت ایوب خان کی گول میز کانفرنس کے بعد مختلف جماعتوں کے کردار اور اسلام پسند عناصر کے اتحاد میں ناکامی کے اسباب وعوامل سے بحث مقصود ہے۔

انتخابات میں اسلام پسند جماعتوں کی ناکامی کا ردعمل، مختلف حلقوں میں مختلف ہوا ہے اور مختلف ذہنوں نے اس سے مختلف اثرات قبول کیے ہیں۔

ایک خاص حلقے میں اسلام پسند عناصر کی شکست کو اسلام کی شکست سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔

حتیٰ کہ بعض ذہن اب پاکستان میں اسلام کے مستقبل کو تاریک سمجھنے لگے ہیں۔

بعض اطراف سے اس ناکامی کا الزام مختلف اسلام پسند جماعتوں پر ڈالا جا رہا ہے۔

جماعت اسلامی اس معاملے میں سب سے زیادہ مستعد ہے۔ اس وقت اس کی تمام تر صلاحیتیں اس امر میں صرف ہو رہی ہیں کہ اس ناکامی کی ذمہ داری وہ دوسروں پر ڈال کر اپنے دامن کو پاک وصاف ثابت کر دے۔ جماعت اسلامی نے حقائق کو پس پشت ڈال کر اسباب ونتائج کی جو تصویر لوگوں کو دکھانی شروع کی ہے۔ اس نے صرف اسی کے اخلاق و

دیانت کا فیصلہ نہیں کر دیا ہے بلکہ اس کا ایک خطرناک پہلو یہ ہے کہ آئندہ صحیح راہ اور طرز عمل اختیار کرنے کی راہیں مسدود ہوتی جائیں گی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اگر ہم ہار گئے تو حقیقت پسندی کا ثبوت دیں اور صاف صاف اس کا اعتراف کرلیں۔ اگر اس ناکامی میں ہمارا کچھ حصہ ہے تو اس کو بلا چون و چرا تسلیم کرلیں اور اگر اس میں کسی دوسری جماعت کی ذمہ داری ہے تو الزام کے جذبے کی بجائے افہام واظہار حق کے نقطۂ نظر سے اس کے اسباب کو سامنے لائیں اور یہ سمجھ لیں کہ پردوں کو ہٹائے اور نقابوں کو الٹے بغیر ہم حقیقت کا چہرہ نہیں دیکھ سکتے اور اس کے بغیر نظر بصیرت وا نہیں ہوسکتی؟ یہ ایک ناگزیر فرض ہے جسے ہم ادا کرنے پر مجبور ہیں۔ اس تحریر کا اصل مقصد کسی شخص یا کسی جماعت کی مخالفت یا اس پر کیچڑ اچھالنا ہرگز نہیں ہے۔ جماعت اسلامی اور اس کے رہنماؤں کا رویہ اگر ہدف تنقید بنا ہے تو یہ حالات کا ناگزیر تقاضا اور ادائے فرض کی مجبوری ہے۔

میں نے اپنی پوری زندگی میں یا پاکستان کی ۲۳ سالہ تاریخ میں جبکہ میں سیاسیات سے بہت قریب رہا ہوں اور ہر سطح کی اور ہر قسم کی شخصیتوں سے میرا سابقہ پڑا ہے اور قومی زندگی کے مختلف مراحل میں مختلف جماعتوں کے کردار پر میری نظر رہی ہے۔ نیز خوش گوار اور ناخوش گوار بہت سے تجربات ہوئے ہیں۔ لیکن کسی کی مخالفت بے جا یا کسی کو رسوا کرنے کی معصیت سے بھی زبان و قلم کو آلودہ نہیں کیا۔ جب بھی اس قسم کا خیال آیا تو اس جماعت یا افراد کی مجبوریوں پر نظر گئی۔

یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ جماعت اسلامی سے مجھے شدید اختلافات ہیں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کے دینی تصورات اور فقہی اجتہادات سے میں نے ہمیشہ اختلاف کیا۔ جماعت اسلامی کی سیاست اور اس کے طریقہ کار کو بھی میں نے اپنی دینی اور اسلامی بصیرت کی بناء پر پسندیدہ نہیں سمجھا۔ میں نے ان کی علمی تحقیقات اور ان کے تاریخی کارناموں کو حقیقت کے برعکس بھی سمجھا اور مصالح امت کے خلاف بھی پایا۔

ان کے بعض خیالات میرے نزدیک صریح گمراہی اور بے دینی پر مبنی ہیں۔ مختلف مواقع پر میں نے خود مودودی صاحب کو ٹوکا بھی ہے اور ان سے ان کی علمی تحقیقات اور فقہی

اجتہادات میں رویے کی تبدیلی اور فقہ وحدیث کے معاملات میں رائے دینے سے گریز کی درخواست بھی کی ہے کہ یہ علوم وفنون ان کے دائرہ علم وتعلیم میں نہیں آتے ہیں۔ ان کی طبع آزمائی کے اظہار کے لئے ہماری ادبی وسیاسی زندگی کے بہت سے موضوعات ہیں جن میں ان کی جولانی طبع اور قلم فرسائی سے قوم کو فائدہ بھی پہنچ سکتا ہے۔ لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ اگر کسی نے مولانا مودودی صاحب کے فکر واجتہاد کے بارے میں مجھ سے کوئی بات دریافت کی ہے تو میں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ الحمدللہ کہ کتمان حق کی معصیت سے بھی میرا دامن پاک رہا ہے اور میں نے کبھی یہ پسند نہیں کیا کہ گونگے شیطان کی وعید نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کا مورد ہوں۔ لیکن محض مخالفت، الزام اور کیچڑ اچھالنا میرا مقصد کبھی نہیں رہا۔

ہمارے ملک میں شروع سے اسلام اور لادینی افکار، بے دین جماعتوں اور اسلامی نقطہ نظر رکھنے والی جماعتوں اور دشمن اسلام قوتوں اور اسلام پسند عناصر کے مابین مقابلہ اور تصادم رہا ہے۔ اس تصادم میں جماعت اسلامی اور مولانا مودودی صاحب کی مخالفت کو مسئلہ بنالینا میں نے ہمیشہ اسلامی مفاد کے خلاف سمجھا اور میں ہمیشہ اپنے اس یقین پر قائم رہا کہ جماعت اسلامی سے مقابلہ وتصادم میں جماعت اسلامی کو نقصان پہنچے یا نہ پہنچے، لادینی عناصر کو فائدہ ضرور پہنچے گا، اور یہ بات کسی مرحلے میں بھی میرے نزدیک پسندیدہ نہیں تھی۔ اس لئے جماعت اسلامی کی مخالفت کو کبھی مسئلہ نہیں بنایا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں جماعت اسلامی کے افکار وخیالات کا حامی یا مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا معتقد ہوں لیکن لادینی عناصر کا دشمن ضرور ہوں اور اپنے کسی فکری ونظری اختلاف سے انہیں فائدہ پہنچانا کبھی مطلوب ومحبوب نہیں رہا۔

سنہ ۱۹۵۰ء کے انتخابات میں جماعت اسلامی اور مولانا مودودی صاحب اس وقت کی مسلم لیگ اور اس کے لیڈر نوابزادہ لیاقت علی خان کی مخالفت میں اس سے بہت زیادہ شدید تھے۔ جتنے کہ وہ آج مسلم لیگ کے مخالف ہیں اور اس وقت ان کے اخبارات، روزنامہ تسنیم اور کوثر وغیرہ میں اس سے بہت زیادہ شدید مضمون نکلتے تھے جتنے شدید اور تیز و تند زندگی، جسارت وغیرہ میں سنہ ۱۹۷۰ء میں نکلے ہیں اور میرا تعلق اس وقت کی مسلم لیگ اور حکومت کے سرآوردہ اصحاب سے آج کے مقابلے میں بہت زیادہ اور قریبی تھا۔

نواب زادہ لیاقت علی خان مرحوم نے جماعت اسلامی اور مولانا مودودی صاحب کے خلاف ہمارا تعاون بھی چاہا مگر ہم اپنی اسی پالیسی پر قائم رہے جو ہماری بصیرت نے ہمیں صحیح بتائی تھی اور جس سے ملت اسلامیہ کا اور اسلام کا مفاد وابستہ تھا لیاقت علی خان مرحوم نے ہم سے مایوس ہوکر بعض دوسرے علماء کا تعاون حاصل کیا اور انہوں نے جماعت اسلامی کی بری گت بنادی۔

اس کے بعد بھی خواجہ ناظم الدین، مسٹر غلام محمد، میجر جنرل اسکندر مرزا اور سب سے آخر میں ایوب خان کے مختلف زمانوں میں جماعت اسلامی کے خلاف محاذ بنائے گئے اور اس میں ہمارا تعاون حاصل کرنے کی بہت کوشش کی گئی۔ لیکن ہمارے پیش نظر جماعت اسلامی کی مخالفت سے زیادہ اہم اسلام اور پاکستان میں اسلامی تحریک کا مفاد تھا۔ اس لئے ان تمام حکومتوں کو ہمارا تعاون حاصل کرنے میں مایوس ہونا پڑا۔ اور جماعت اسلامی اور مولانا مودودی صاحب سے شدید اختلافات کے باوجود ان کے مقابلے میں کسی حکومت کا آلہ کار بننا ہم نے پسند نہ کیا۔

جماعت اسلامی کی مخالفت میں ایوب خان کو مایوس کرنے ہی کا نتیجہ تھا کہ دیوبندی مکتبہ فکر کے علماء ان کے معتوب قرار پائے اور ایوب خان کے یہ طعنے سنے کہ دیوبندی مکتبہ فکر بھی جماعت اسلامی کی ایک شاخ ہے۔ حالانکہ اسی مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے بعض علماء نے اس موقع پر جماعت اسلامی اور مولانا مودودی صاحب کے خلاف ایک زبردست مہم چلائی۔ ان کے افکار ونظریات پر سخت تنقیدیں کیں اور ان کے اصول وفقہی اجتہادات پر سخت گرفت کی اور اس طرح جماعت اسلامی کا ناطقہ بند کردیا۔ اس وقت بھی ہم نے مولانا مودودی صاحب یا جماعت اسلامی کے خلاف زبان کھولنا اسلامی مفاد کے خلاف سمجھا اور یہی یقین کیا کہ اس سے نقصان اسلامی اخوت اور اسلام پسند عناصر کو پہنچے گا اور فائدہ بے دین حکومت اٹھائے گی۔

ہماری اس حکمت عملی اور پالیسی کی بنا پر خود ہمارے بعض بزرگوں نے ہمیں چھوڑ دیا اور ہم سے ناراض ہوگئے ہم نے اپنے بزرگوں کی خفگی اور ناراضگی کو ان کے اخلاص کے خلاف نہیں سمجھا۔ لیکن ہمیں اپنے رائے کے بارے میں بھی یمین ویسار کا تذبذب نہیں پیدا ہوا۔ اللہ تعالیٰ مولانا حسرت موہانی کو غریق رحمت کرے۔ کیا خوب کہہ گئے ہیں

طعن احباب سنے، سرزنش خلق سہی
ہم نے کیا کیا، تری خاطر سے گوارا نہ کیا!

اگست سنہ ۱۹۶۹ء میں جب سوشلزم کے خلاف ملک گیر پیمانے پر مہم چلائی گئی تو ہم پر جگہ جگہ مودودی کے ایجنٹ اور مودودی کے پٹھو، کے آوازے کسے گئے اور صرف مولانا مودودی صاحب کی مخالفت نہ کرنے کے جرم میں ہدف تنقید واستہزاء بننا پڑا یہاں تک کہ حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب مدظلہ ہم سے صرف اس بات پر جدا ہوگئے کہ انہیں ہمارے اسٹیج پر مولانا مودودی صاحب کا نام لے کر ان کی مخالفت کی اجازت نہیں دی گئی۔

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بے گانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

اس کے برعکس مولانا مودودی صاحب ان کے رفقاء اور ان کے اخبارات ورسائل نے ہمارے اس تعاون کا کتنا اعتراف اور اسلامی مفاد ومصالح کا کتنا لحاظ کیا اس کا اندازہ اس کتاب میں پیش کردہ حقائق کے مطالعے سے لگایا جاسکتا ہے۔

علماء کے وقار سے جماعت اسلامی کی تعصب پسندی کی داستان بڑی طویل اور افسوسناک ہے۔

اس باب میں اس نے بے دین عناصر کو بھی بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ جماعت اسلامی کے ادب وشاعری میں علماء کی عزت اوران کا ناموس طنز اور مزاح کا ایک خاص موضوع رہا ہے۔

انہوں نے اسلامی ادب کے نام پر جو کارنامہ انجام دیا ہے۔اس کا تجزیہ اور اس پر تبصرہ ایک الگ موضوع ہے اور کسی دردمند نقاد کی توجہ کا منتظر۔

جماعت اسلامی نے علماء کو کبھی قابل احترام سمجھا ہی نہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے لے کر مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی، اکابر دیوبند اور اس وقت کے علماء تک ہر کوئی ان کی قلم کاریوں کا نخچیر اور ہر دامن ان کی دست درازیوں کا شاکی ہے۔

حتیٰ کہ انتخابات سے دو تین روز پہلے مولانا عبدالحلیم صدیقی مرحوم کی صاحبزادی کے سلسلے میں اور مرحوم کے صاحبزادے اور جمعیت علمائے پاکستان کے رہنما مولانا احمد شاہ نورانی کے بارے میں جسارت میں جو کیچڑ اچھالی گئی وہ اس درجہ شرمناک تھی کہ اس کے

تصور سے گھن آتی ہے اور اپنی نجی مجلسوں میں ان ہر دو کے اخلاق و سیرت کے بارے میں جو جو افسانے تخلیق کئے گئے اور جس طرح مزے لے لے کے بیان کیے گئے اور انہیں پھیلایا گیا اس سے جماعت اسلامی کی خاص ذہنی وفکری تربیت کا پتا چلتا ہے۔

لیکن اب اس سے اس کی شکایت بھی نہیں کرنی چاہئے، جس نے صحابہ کرام کے بارے میں جو کفر کی ظلمت میں ہدایت کے روشن ستارے ہیں، تنقید سے بالاتر نہ ہونے کا صرف عقیدہ ہی نہیں رکھا، بلکہ عملاً ہدف تنقید بھی بناڈالا ہو اور ان کے ناموس کالحاظ نہ کیا ہو اس سے علماء کے عہد یا کسی محترم خاتون کی عزت واحترام کی توقع چہ معنی دارد یہاں تک کہ وہ علماء جو جماعت اسلامی کے ساتھ تعاون واشتراک سے کبھی دست کش نہیں ہوئے وہ بھی ان کی تغافل کیشیوں کی شاکی ہیں۔ جماعت اسلامی نے علماء کی پگڑیاں اچھالنے میں ان کی کمزوریوں کو طشت از بام کرنے میں انہیں رسوا کرنے میں اور انہیں آپس میں لڑانے میں افسوسناک کردار ادا کیا ہے۔

لیکن اب تاریخ اس موڑ پر آ گئی ہے کہ اگر اس تاریخ کو محفوظ نہ کر دیا گیا تو ایک تاریخی نقصان بھی ہو گا اور اگر پہلے اختلاف کرنا اسلامی مفاد کے خلاف تھا تو اب اس اختلاف اور جماعت اسلامی کے کردار سے پردہ نہ اٹھانا بھی دینی وسیاسی مصالح کے خلاف ہے۔

میرا مقصد شکایات کے یہ دفتر کھولنا نہیں ہے بلکہ جماعت اسلامی کا وہ کردار بیان کرنا ہے جس کا مظاہرہ اس نے پچھلے ڈیڑھ دو سال کی سیاسی زندگی میں سوشلزم اور اسلام کی جنگ کے دوران میں اسلامی نقطہ نظر رکھنے والی جماعتوں کے مابین اتحاد کے مذاکرات میں اور انتخابات میں اسلامی عناصر سے اشتراک وتعاون میں کیا اور یہ اس لئے ضروری ٹھہرا کہ آئندہ سیاسی سفر میں ہم ان غلطیوں کا اعادہ نہ کریں جو کر چکے ہیں۔

اتحاد کی راہ میں جماعت اسلامی کے کردار کو سامنے لانے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسئلے کے تمام پہلو روشنی میں اور تمام نقطہ ہائے نظر سامنے ہوں تا کہ صحیح نتائج تک پہنچ سکیں اور اتحاد کی صراط مستقیم سے ادھر ادھر نہ ہونے پائیں۔ یہ مقصد بے لاگ تجزیے اور حقائق کے بے غرضانہ اظہار وانکشاف کے بغیر ممکن نہ تھا اگر کہیں لہجے میں درشتی اور قلم میں تیزی آ گئی ہو تو جائے تعجب نہیں۔ حالانکہ اگر جماعت اسلامی پر محض تنقید کا جذبہ بھی کارفرما

ہوتو اس کے لئے بھی وجہ جواز موجود ہے آخر جماعت اسلامی کے اکابر واصاغر اور اس کے اخبارات ورسائل نے ہمارے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہے؟ ہمارے اسلاف اور وقت کی دینی و سیاسی جماعتوں، تحریکوں اور شخصیتوں کے بارے میں اس کی جو روش رہی ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اس لئے اگر اضطرار و اضطراب میں ضبط کا دامن ہمارے ہاتھوں سے چھوٹ جائے یا جفاو ستم سے گھبرا کر ہمارے منہ سے آہ نکل جائے تو کوئی شکوہ سنج کیوں ہو۔ آخر ہم بھی انسان ہیں اور پہلو میں پتھر کا بے حس ٹکڑا نہیں حساس دل رکھتے ہیں۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

جماعت اسلامی اپنے انداز اور طریقہ کار کے مطابق اپنا کام کر رہی ہے۔

میرے دوستوں اور مخلصوں کا خیال تھا کہ چونکہ پچھلے ڈیڑھ دو سال میں جو حالات پیش آئے ہیں میں ان سے خود گزرا ہوں اور مختلف جماعتوں کے کردار کا بہت قریب سے مطالعہ کیا ہے اس لئے میں بھی اپنے تجربات اور مشاہدات کو قلم بند کر دوں تا کہ لوگوں کے سامنے واقعات کا صرف وہی رخ نہ آئے جو جماعت اسلامی لوگوں کو دکھانا چاہتی ہے، بلکہ انہیں اس رخ سے بھی واقفیت ہو جائے، جن پر جماعت اسلامی کے مصالح پردہ ڈالنے، غلط فہمیاں پیدا کرنے یا اسے مسخ کر کے پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا کہ اتحاد کے مذاکرات اور انتخابات کی ناکامی میں ہمارا، دوسروں کا اور جماعت اسلامی کا کتنا حصہ ہے؟ ہمارا نہیں، قارئین کا کام ہے۔

جماعت اسلامی۔ افکار کے آئینے میں
ایک سرسری نظر

جماعت اسلامی کے فکر و عمل میں کئی موڑ آئے اور اس کا کاروان سیاست بہت نشیب و فراز سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہے۔

پہلے وہ ایک اصولی جماعت تھی اور صالح فکر ہی نہیں صالح طریقہ کار کی بھی پابند تھی اور

اس میں اتنی متشدد تھی کہ مسلم لیگ سے اشتراک وتعاون کا سوال اٹھایا تو اس کے غیر صالح معیار کی بناء پر امیر جماعت اسلامی کے نزدیک خواجہ ناظم الدین مرحوم سے تو کیا اس کے پلیٹ فارم پر آسمان سے فرشتے اتر آتے تو ان سے تعاون کا سوال پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔

پہلے وہ ایک ایسی جماعت تھی جو جلسوں، جلوسوں، نعروں، ہنگاموں استقبالیوں، خیر مقدموں، ایڈریسوں اور استقبالیوں کو اسلام کے مزاج کے خلاف سمجھتی تھی۔

پہلے اس کے نزدیک اقتدار میں آنا کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔

الیکشن میں حصہ لینا اس کے نزدیک گویا کتوں کی دوڑ میں حصہ لینا تھا۔

مصر میں فوجی انقلاب کے بعد عورتوں کے سیاست میں حصہ لینے کا سوال اٹھا اور ایک اخبار میں خبر آئی کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے مصر کے بعض علماء کے اس فتوے سے اختلاف کیا ہے جس میں عورتوں کے سیاست میں حصہ لینے اور پارلیمنٹ کا ممبر بننے کے عدم جواز کی رائے ظاہر کی گئی تھی تو جماعت اسلامی نے اس ''بے دینی'' کے خلاف اخبار ورسائل میں ایک محاذ قائم کر دیا اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے ترجمان القرآن میں مولانا آزاد کے بیان واستدلال کے رد میں ایک نہایت مفصل مقالہ لکھا۔

لیکن جب حالات بدل گئے اور محترمہ فاطمہ جناح کی سیاسی سربراہی میں شوق حکومت کی تکمیل ہوتی نظر آئی تو اس کے لئے بھی ایک فلسفہ حکمت عملی تخلیق کرلیا گیا۔

جماعت اسلامی کو احساس ہوا کہ اس کے سفر کا رخ اور انداز اسے منزل سے اور دور رکھ رہا ہے اور یوسف مقصود اس کے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔

خدایا! جذبہ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

تو جہاں بہ تقاضائے وقت وبر بنائے مصلحت ''اسلامی حکمت عملی'' کے تحت صاحب امر وامارت فرائض منصوبہ قرآنیہ وواجبات شرعیہ اسلامیہ میں تبدیلی کرسکتا ہو وہاں ان امور سیاسی کی حیثیت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ چنانچہ۔

جماعت اسلامی کے فکر اور طریقہ کار میں بھی تبدیلی آ گئی اور ضروری ہو گیا کہ سیاسی مسائل کے حل وتصفیہ کے لئے وقتی وسیاسی مصالح پر مبنی طریقہ کار اختیار کیا جائے۔

قیام خلافت الٰہیہ کے اسلامی نصب العین سے اسلامی جمہوریت اور پھر صرف جمہوریت کے نصب العین اور حصول مقصد کے لئے ان جماعتوں تک سے اشتراک وتعاون پر آمادہ ہو گئی جو جماعت اسلامی کی بلند پروازیوں میں نہ پہلے اس کا ساتھ دے سکتی تھیں اور نہ اس "متحدہ محاذ" کی شرائط میں ان کے لئے جماعت اسلامی کے منشور سے اتفاق اور مقاصد کی تائید کی شرط لازم تھی، نہ وہ جماعتیں "اسلامی فکر" کی حامل تھیں اور نہ صرف صالح طریقہ کار پر ایمان رکھتی تھیں۔

جلسوں، جلوسوں، نعروں، استقبالیوں، خیر مقدموں، ایڈریسوں وغیرہ کی اہمیت کا اعتراف بھی نہ صرف زبانی اور فکری طور پر کیا بلکہ ان کے اہتمام میں تاریخ سیاست کے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔

پھر اس کے لئے اقتدار میں آنا اتنا ضروری ہو گیا کہ اس کے بغیر جماعت کے اسلامی مشن کی تکمیل ممکن ہی نظر نہ آتی تھی اور اس کے لئے استدلال میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ خلافت الٰہیہ کے قیام کا مقصد اقتدار وحکومت کے بغیر نامکمل محسوس ہونے لگا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی اسلام کی دعوت وتبلیغ کا ایک نقش ناتمام اور ہجرت مدینہ اقدام تکمیل دعوت کی بجائے اس پر خط تنسیخ نظر آنے لگا۔

سیاست میں عورتوں کے حصہ لینے کے جواز کے حق میں اخباری نمائندے کی رپورٹ کو جس کی مولانا آزاد سے نسبت کی تصدیق بھی نہیں ہوئی تھی اسے "امام الہند کے فتویٰ شرعیہ" کی حیثیت سے پیش کیا گیا اور پاکستان کے صدارتی انتخابات میں محترمہ فاطمہ جناح کی تائید میں اپنے رویے کی اسلامی حیثیت پر اس بیان سے استدلال کیا گیا اور مصلحت وقت نے انہیں عالم دین اور مفتی شرع متین کی حیثیت سے پیش کرا دیا۔

پہلے ان کا فتویٰ بھی قابل رد تھا پھر مفاد ومصالح کا تقاضا ہوا تو ان سے متعلق ایک اخباری رپورٹ بھی حجت شرعیہ بن گئی۔

ایک وقت تھا کہ مولانا آزاد بے دینی کی علامت تھے پھر وہ وقت بھی آیا کہ داڑھی کے مسئلے میں اور اسلامی قوانین کے نفاذ کے سلسلے میں ان کے افکار سے مولانا مودودی صاحب کے خیالات کی تائید کی گئی۔

مولانا آزاد کے خیالات کا رد اور ان کی شخصیت کی نفی جماعت اسلامی کے اکابر اور ان کے اخبار و رسائل کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ لیکن جب اکابر دیوبند اور دیگر علمائے اسلام نے مولانا مودودی صاحب کا رد اور تعاقب کیا اور انہیں کوئی جائے پناہ نہ ملی تو مولانا آزاد ہی کے دامن افکار میں پناہ ڈھونڈی حتیٰ کہ مولانا مرحوم کی طرف سے مودودی صاحب کی مدح و توصیف میں ایک جعلی خط بھی وضع کر لیا گیا۔

تمہاری زلف میں آئی تو حسن کہلائی وہ تیرگی جو مرے نامہ سیاہ میں ہے

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی کے فکر و کردار کا کون سا رخ صحیح اور اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے؟ تو یہ ایک الگ بحث ہے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علم و بصیرت، اعتدال و توازن اور اخلاص و بے غرضی سے اس کے فکر و کردار کے دونوں رخ خالی ہیں۔

اللہ اللہ ایک وہ زمانہ بھی تھا کہ فرنگی سرکار کی ''حسن خدمات'' اور برٹش حکومت کے قیام و استحکام میں تعاون اور اہل وطن کے خلاف مخبری کے عوض مجاہدین آزادی کو پھانسی کے تختوں پر لٹکوانے کے صلے میں اور انعام میں جو زمینیں انگریزوں نے دی تھیں ان کے لئے ''اسلامی زمینداریاں'' کی اصطلاح جماعت اسلامی کی علمی و فقہی ٹکسال سے ڈھل کر نکلی تھی اور ان زمینداریوں کے تحفظ و بقا کے لئے اس کا مکتبہ فکر جدید علم کلام کی تدوین میں کوشاں تھا اور کہاں یہ وقت بھی آیا کہ بلا کسی استثنا کے ایک خاص حد سے زائد زمین کو حکومت کے قبضے میں لے لینے اور کاشتکاروں کو اس کے مالکانہ حقوق کے عطا کر مژدہ جانفزا سنایا گیا۔

اور جن سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کو ان کے سرمایوں اور صنعتوں کے ''اسلامی نظریہ تحفظ'' کی بشارتیں سنائی جا رہی تھیں اب انہیں بھی قومی ملکیت میں لیے جانے کے عوامی مطالبے کو جماعت کے ''اسلامی منشور'' میں شامل کر لیا گیا۔

یہ اور اس قسم کی پچاسوں باتیں ہیں جن سے اسلامی علوم و فنون کی تاریخ میں کسی نئے

قوانین کا اضافہ ہوا ہو یا نہ ہو، اس کا فیصلہ تو اہل علم وفن ہی کریں گے، لیکن شیخ محمد اکرام صاحب کو برصغیر کے مسلمانوں کی علمی وتہذیبی تاریخ (موج کوثر) کے لئے ایڈیشن میں تو معتزلہ یا معتزلین جدید کے عنوان سے ایک نئے باب کا اضافہ ضرور کرنا چاہئے جس میں افکار وسیرت جماعت اسلامی کے نشیب وفراز کی پوری تاریخ مرتب ہو جائے اور اگر کوئی چاہے تو تعبیرات وتاویلات جماعت اسلامی سے ایک نئی کتاب الحیل بھی مرتب کی جاسکتی ہے۔

اس کا اور کوئی نتیجہ نکلا ہو یا نہ نکلا ہو اور نکلے یا نہ نکلے لیکن اس بات میں دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ جماعت اسلامی کے کردار نے اس کا اعتبار کھو دیا اب کوئی جماعت اس سے معاہدہ کرتے ہوئے اس کی یقین دہانیوں پر اعتماد نہیں کر سکتی۔

چنانچہ یکم جنوری سنہ ۱۹۷۰ء کو سیاسی جدوجہد کا باب مقصود کھلتے ہی نشتر پارک کراچی کے پہلے مشترکہ جلسہ عام میں میاں طفیل محمد صاحب کی تقریر کے بعد بھی یہ بحث چھڑ گئی تھی۔

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کسی کا آشنا

اور حالات نے اس خدشے کو درست ثابت کر دیا۔ جماعت اسلامی نے اتحاد وتعاون کی ہر امید پر پانی پھیرا۔ آخر میں چند ایسی جماعتوں کے اتحاد کا ڈرامہ کھیلا گیا جن پر خود جماعت کے فلسفہ اجتماع کے مطابق جماعت کا اطلاق نہیں ہوتا تھا لیکن اس وقت وہ ملک کی مقتدر جماعتیں تھیں۔ لیکن جب اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہوا تو خود ان کے اخبار کے مطابق ان کی حیثیت محلہ کمیٹیوں سے زیادہ نہیں تھی اور جن جماعتوں سے اتحاد ملک وملت کی بہی خواہی اور اسلام کے بہترین مفاد کا تقاضا تھا۔ ان سے نہ خود اتحاد کیا نہ دوسری جماعتوں کو مل بیٹھنے کے قابل رکھا۔

پہلے ایسے حالات پیدا کیے کہ جمعیت علمائے پاکستان ان کی بزم ناز سے اٹھی پھر جمعیت علمائے اسلام کے اعتماد کو مجروح کیا، پاکستان جمہوری پارٹی نے دور تک ساتھ دیا لیکن۔

ناوک نے تیرے صید نے چھوڑا زمانے میں !

نواب زادہ نصر اللہ خان بھی ان کی تیر افگنیوں کا شکار ہوئے اور بالآخران سے بھی ٹھن گئی۔ غالب مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

بوئے گل، نالہ دل، دود چراغ محفل جو تیری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا

ایک وقت وہ بھی تھا کہ نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب کی اسلام پسندی اور سوشلسٹوں کے خلاف ان کی جہد آزمائی اتحاد کی راہ میں ان کے ایثار، بے نفسی اور ان کے جذبات صالحہ وصادقہ کے تذکرے میں مولانا مودودی صاحب رطب اللسان تھے اور صاحب "زندگی" کو ان کے اس قرب واعتماد پر رشک آتا تھا اور "زندگی" میں باحسرت ویاس اس کی روداد چھاپتے تھے۔

جو کوئی آئے ہے نزدیک ہی بیٹھے ہے ترے
ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جائیں

اور پھر چرخ کہن سال نے یہ منظر بھی بادیدہ حیراں دیکھا کہ "زندگی" کے ایک کارٹون میں مولانا مودودی صاحب انہیں نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب کی تیر افگنیوں سے برنگ بسمل تڑپ رہے ہیں اور نواب زادہ صاحب اپنی کمین گاہ سے رقص بسمل کا یہ تماشا دیکھ رہے ہیں۔ اس کارٹون پر مولانا مودودی صاحب کی زبان سے یہ شعر کیا خوب اور برمحل تھا!

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی!

جماعت اسلامی فکر وعمل کے جن نشیب وفراز سے گزری ہے۔ یہ اس کی مختصر روداد تھی۔ اگلے صفحات میں اسلامی نقطہ نظر رکھنے والی جماعتوں کے مابین اتحاد کی کوششوں اور راہ کی ناکامیوں کا تذکرہ ہے۔ اس میں بھی جماعت اسلامی کا کردار زیر بحث آیا ہے۔ اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ جماعت اسلامی کا اب تک وہی رویہ ہے۔

زمانہ بدل گیا لیکن اس نے اپنی خو نہیں چھوڑی

کرسی اقتدار اور منصب سیاست سے ایوب خان کے دستبردار ہوتے ہی تاریخ پاکستان کی بدترین آمریت کے دور کا خاتمہ تو ہو گیا۔ لیکن اس دور میں آزاد خیال اور اشتراکیت کے جو بیج بوئے گئے تھے وہ اب تناور درخت بن چکے تھے اور پھل پھول رہے تھے۔ سوشلزم کا فتنہ تہذیب واخلاق اور روحانی قدروں ہی کے لئے نہیں، ملکی سالمیت کے لئے بھی ایک عظیم خطرہ بن چکا تھا۔ لادینی ازموں کے تیز وتند حملوں سے نظریہ پاکستان کے نقوش

دھندلے پڑ گئے تھے۔ علیحدگی پسندی کے نعرے زور شور سے لگ رہے تھے۔ ملکی سیاست پر ایسے افراد اور گروہوں کی اجارہ داری قائم ہوتی جارہی تھی، جو مکمل ضابطہ حیات کی حیثیت سے اسلام پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ محمود علی قصوری نے پنڈی میں وکلاء سے خطاب کرتے ہوئے برملا اس کا اظہار بھی کیا تھا کہ قرآن صرف ضابطہ اخلاق ہے۔ سیاسی و معاشی ضابطہ نہیں ہے۔ قیام پاکستان کی بنیادوں میں سے اسلام کو خارج کرنے اور تحریک پاکستان کی اساس صرف معاشی واقتصادی منصوبوں کو قرار دینے کی سازشیں کی جارہی تھیں۔ علاقائی تہذیبوں اور زبانوں کے مسائل کو اچھالا جارہا تھا۔ مختلف قسم کے تعصبات کو ہوا دی جارہی تھی۔ غرض یہ کہ ملک کے حالات اس درجہ پیچیدہ اور خطرناک صورت اختیار کر چکے تھے کہ ان سے نمٹنا اور مخالف قوتوں سے نبرد آزما ہونا تنہا کسی ایک جماعت کے بس کی بات نہیں رہی تھی اس کے لئے ضروری تھا کہ سوشلزم اور علیحدگی پسندی کی مخالف، نظریہ پاکستان پر ایمان اور اسلامی نقطہ نظر رکھنے والی تمام سیاسی جماعتیں اور تمام مکاتب فکر کی دینی جماعتیں متحد ہوں اور عوام میں ایک منظم اور زبردست تحریک شروع کی جائے۔

اخباری پروپیگنڈے نے بڑھا چڑھا کر جماعت اسلامی کی جو حیثیت لوگوں کے ذہنوں میں قائم کر دی تھی اس کی بناء پر جماعت اسلامی کی طرف لوگوں کا ذہن جا سکتا تھا کہ وہ ان حالات میں رہنمائی کے لئے آگے بڑھے اور اسلام و نظریہ پاکستان کو مختلف ازموں کی زد سے بچائے مگر جیسا کہ سطور بالا میں کہا گیا ہے، جماعت کا قلعہ صرف پروپیگنڈہ کی ہوا پر قائم تھا کسی شہر کسی صوبے اور کسی طبقے میں بھی جماعت کو مقبولیت اور رسوخ حاصل نہیں تھا اور جو تھوڑے بہت اثرات تھے بھی تو مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی اور مفتی محمود صاحب نے نہ صرف یہ کہ ان کا قلع قمع کر دیا تھا بلکہ پورے ملک میں منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑا تھا۔ ہزاروی گروپ نے جماعت کی سیاسی قلابازیوں اور فکری واعتقادی گمراہیوں کو قوم کے سامنے پیش کر کے اس کے خلاف اتنی زبردست تحریک چلائی کہ جماعت میں کسی کے سامنے ٹھہرنے اور مقابلہ کرنے کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔ اس موقع پر جماعت اسلامی کے لئے لادینی عناصر کے خلاف تحریک چلانا تو درکنار اپنی مدافعت بھی مشکل تھی بلکہ جماعت کی تمام صلاحیتیں مفتی

محمود اور مولانا غلام غوث ہزاروی کے مظالم کی دہائی اور فریاد کے لئے وقف ہوگئی تھیں۔

اگر مشرقی و مغربی پاکستان میں لادینی ازموں کے خلاف مرکزی جمعیت علمائے اسلام کے بروقت اور کامیاب جہاد سے پیدا شدہ اسلامی فضا کا زبردست سہارا جماعت اسلامی کو نہ ملا ہوتا تو جماعت اسلامی پورے ملک میں کسی جگہ ایک جلسہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ مشرقی و مغربی پاکستان کے متعدد شہروں کے رہنے والے دردمند مسلمان اس پر گواہ ہیں کہ ہم نے اپنی جانوں پر کھیل کر ایسے مقامات پر سوشلزم کے خلاف جلسے کیے جہاں جماعت اسلامی سمیت کسی اسلام پسند جماعت کو جلسہ کرنے کی ہمت نہ تھی۔ ملتان، بنوں، کوہاٹ، ڈیرہ اسماعیل خان اور مردان وغیرہ مقامات پر ہم یہ سمجھ کر جلسوں میں شریک ہوتے رہے کہ ممکن ہے وہاں سے صحیح سلامت واپسی ممکن نہ ہو۔

جماعت اسلامی نے مرکزی جمعیت کی ان مجاہدانہ خدمات کی داد اور نتیجے میں پیدا شدہ اسلامی ماحول سے فائدہ اٹھانے کا شکریہ اس طرح ادا کیا کہ مرکزی جمعیت کی تنظیم کو سبوتاژ کرنے اور اپنے مقصد میں استعمال کرنے کے لئے ہر جگہ جماعت اسلامی اور اس کی ذیلی تنظیم اتحاد العلماء کے ارکان جمعیت کے عہدے دار بن جاتے تھے اور اندرونی طور پر یہ کوشش کرتے تھے کہ مرکزی جمعیت علمائے اسلام منظم و مستحکم نہ ہونے پائے جب اس صورت حال سے بچنے کی ہماری طرف سے تدابیر اختیار کی گئیں اور ان حضرات کے رویے کے خلاف آواز اٹھائی گئی تو یہ بات بھی طبع نازک پر گراں گذری اور امیر جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے بڑے تند اور تہدید آمیز لہجہ میں جمعیت کے جلسوں کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعث افزائش درد نہاں وہ بھی

لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے ارادوں کے علی الرغم جمعیت کو سوشلزم کے مقابلے میں ہر جگہ امید سے زیادہ کامیابی عطا فرمائی۔ سوشلزم کے خلاف مرکزی جمعیت علمائے اسلام کی تبلیغی مہم میں جماعت اسلامی کی جو افسوسناک روش رہی اس سے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے کہ جماعت اسلامی سوشلزم کے خلاف جدوجہد میں بھی سنجیدہ نہیں تھی، جس درجے سوشلزم

سے مسلمانوں کوڈرا کر ملک کا انتخاب جیتنے کے لیے وہ بے چین و بے قرار تھی۔ علیحدگی پسند اور لادینی ازموں کے خلاف ہماری تبلیغی مہم کے ساتھ ساتھ مرکزی جمعیت علمائے اسلام کی تنظیم کا کام بھی جاری رہا اور الحمدللہ کہ وہ بہت جلد ملک کی ایک فعال جماعت اور موثر قوت بن گئی۔

سوشلزم اور نیشنلزم کے موضوع پر مولانا کی تقریر سے چند اقتباسات

گذشتہ ہفتہ قائد مرکزی جمعیۃ حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی نے راولپنڈی اور سندھ کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا۔ اس دورہ میں آپ نے جو عوام سے خطاب فرمایا۔ اس کے چیدہ چیدہ اقتباسات ھدیہ قارئین ہیں۔

راولپنڈی، ممتاز عالم دین اور مرکزی جمعیت علماء اسلام کے رہنما مولانا احتشام الحق تھانوی نے پاکستانی عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ آئندہ انتخابات میں سوشلزم اور نیشنلزم کے فتنوں کو ختم کرنے کی کوششیں کریں یہ دونوں وبائی بیماریوں کی طرح پاکستان کو ختم کرنا چاہتے ہیں آپ نے کہا آج اسلام اور سوشلزم کی جنگ نہیں بلکہ عقل اور وحی کی جنگ ہے سوشلزم کا نام لینے والے پاکستان سے انتقام لینا چاہتے ہیں مگر اسلام اور اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا پاکستان اُن دونوں فتنوں کو ختم کر دے گا مولانا تھانوی گذشتہ روز راولپنڈی میں صلاح الدین ایوبی روڈ مرکزی مدرسہ دارالتجوید وحفظ القرآن کے سالانہ اجلاس سے خطاب کر رہے تھے اس اجلاس کی صدارت سیلون کے ہائی کمشنر مسٹر رزاق فرید نے کی اور ان کے علاوہ جمعیت اشاعت التوحید والسنّت کے صدر مولانا عنایت اللہ شاہ بخاری نے خطاب کیا۔ شاہ صاحب نے عوام کو سوشلزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے آگاہ کیا اور مولانا تھانوی نے قومیت یا وطن پرستی کو مسلمانوں کے لئے زہر قرار دیتے ہوئے اس کے تدارک کی تلقین کی۔ مولانا تھانوی نے کہا آج جھگڑا اسلام و سوشلزم کا نہیں بلکہ اس بات کا ہے کہ انسان اپنی زندگی کو وحی کے سپرد کرے یا کسی دنیاوی مفکر کی تحویل میں دے قرآن پاک بنیادی طور پر اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ انسان کا تعلق اللہ کی وحی سے ہے

انسان کو اپنے پیدا کرنے والے کا تصور ہی ذہن میں رکھنا ہوگا۔ مولانا نے کہا عقل اور وحی کی اس جنگ میں انسانوں نے عقل کے ذریعہ انسانوں کو تقسیم کرنے کے لئے کئی نقشے بنائے کسی نے اس نقشے کو سوشلزم کا نام دیا کسی نے کیپٹلزم اور کسی نے نیشنلزم رکھا یعنی خدا کی وحی کے مقابلہ میں ازم کو لایا گیا دنیا میں تمام خرابیاں ان ازموں نے ہی پیدا کی ہیں پاکستان میں سوشلزم کا نعرہ لگانے والوں کے بارے میں مولانا نے کہا اب یہ لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ انہوں نے غلط وقت میں نعرہ لگایا کیونکہ اس وقت ہر طرف سے اسلام اسلام کی آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ سوشلزم کا نعرہ اس وقت لگانا چاہئے تھا جب مسلمان مذہب کے بارے میں بالکل دور چلے جاتے مولانا نے کہا جس طرح چور کا تعاقب کرنے والے چور چور کی آوازیں دیتے ہیں اور چور بھی اپنے آپ کو بچانے کے لئے چور چور کہنا شروع کر دیتا ہے بالکل اسی طرح اب یہ قرآن وسنت کا نام بھی لے رہے ہیں کیونکہ چاروں طرف سے اسلامی نظام کی آوازیں اٹھ رہی ہیں۔

مولانا نے کہا کہ لوگوں نے شاید ان کو بتا دیا ہے کہ سوشلزم نہ کہو اس سے نقصان میں رہو گے اس لئے اسلامی مساوات پر آ گئے مگر جب انہیں بتایا گیا اسلام میں مساوات نہیں انصاف ہے تو وہ مساوات محمدی پر اتر آئے آپ نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ ان لوگوں کے گروہ میں چند شکلیں بھی نظر آتی ہیں اگر یہ شکلیں وہاں نہ ہوتیں تو سوشلزم کا لفظ ہی پاکستان کی لغت سے نکل گیا ہوتا مولانا تھانوی نے مزید کہا کہ اب سوشلزم کی بیماری کا نام و نشان تقریباً مٹتا جا رہا ہے کچھ آثار باقی ہیں وہ ختم ہو جائیں گے اس سلسلہ میں آپ نے اپنے مشرقی پاکستان کے دورہ کا ذکر کیا کہ وہاں موسمی سیلاب کی طرح سوشلزم کا سیلاب بھی دب رہا ہے اور اس سلسلہ میں علماء کرام نے جو کردار ادا کیا ہے اس میں وہ مبارک باد کے مستحق ہیں سوشلزم کے بعد اب صرف وطنیت اور لسانی قومیت کا مسئلہ رہ گیا ہے آپ نے کہا اسلام کے اندر رنگ نسل وطن، زبان، یا کسی خاص علاقہ سے قومیں نہیں بنتیں بلکہ کلمہ طیبہ مسلمان قوم کو بناتا ہے خداوند تعالیٰ نے انسانوں کو علاقوں کی بنیاد پر نہیں بلکہ اسلام کی بنیاد پر تقسیم کیا ہے ایک کو کفر اور دوسرے کو مسلم کا درجہ ملا۔ آپ نے کہا قرآن کریم وہ نسخہ ہے جس

میں قوموں کے مرنے جینے کے طریقے بتائے گئے ہیں اس میں وہ زہر ہے جس کو پی کر قومیں مرجاتی ہیں اور وہ تریاق ہے جسے کھا کر چھوٹی سے چھوٹی قوم پہلوان بن جاتی ہے۔

مسلمان کو یہی نسخہ اپنانا چاہیے مولانا نے ''جئے سندھ'' ''پختونستان'' ''بنگلہ دیش'' ''نکسل باڑی'' جیسے علاقائی تعصب کے نعروں کی شدید مذمت کی اور کہا کہ مسلم قوم کو صرف دارالسلام کی ضرورت ہے اور اس کا دوسرا نام مسجد ہے آپ نے پاکستان کو مسجد قرار دیا۔

مولانا نے پاکستان میں غربت میں اضافہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سرکاری ملازمین بداعتدالیوں سے کام نہ لیتے تو یہاں حالت زیادہ خراب نہ ہوتی آپ نے کہا بڑھتی ہوئی سرمایہ داری کا بدلہ اسلام سے کیوں لیا جارہا ہے ان سرکاری افسروں کا دامن پکڑو جنہوں نے یہ غربت پھیلائی ہے۔ آپ نے مزید کہا وطنیت کا نعرہ لگانے والے عربوں سے سبق سیکھیں جہاں انگریز نے مسلمانوں کو وطن کے جذبہ کی بدولت ہی ایک دوسرے سے لڑا کر تباہ کر دیا ہے آپ نے اپیل کی کہ قومیت کے اس جذبہ کو ختم کر کے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں۔

محمد رزاق فرید نے اپنی مختصر تقریر میں مدرسہ دارالتجوید القرآن کی خدمات کو سراہا اور کہا کہ اس مدرسہ سے فارغ التحصیل ہونے والے سینکڑوں طلبہ کو اپنی زندگی قرآن وسنت کے مطابق ڈھالنی چاہئیے آپ نے بتایا کہ سیلون میں خواتین کو قرآنی تعلیم دینے کے لئے باقاعدہ مدرسے کام کررہے ہیں اور اس طرح اسلام کو پھیلانے میں بڑی آسانی پیدا ہورہی ہے آپ نے اپیل کی کہ مسلمانوں کو ضبط نفس اور انسانیت کی خدمت کے لئے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلنا چاہیے۔

سید عنایت اللہ شاہ بخاری نے قرآن کریم کی آیات کا حوالہ دے کر ثابت کیا کہ قرآن اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات پر عمل کرنے والے اور اختلافات کی صورت میں ان کی رائے کو صائب نہ قرار دینے والے مومن نہیں کہلا سکتے آپ نے سوشلزم کا پرچار کرنے والوں کو منافق کہا اور اس بات پر زور دیا کہ انتخابات میں ایمان اور کفر کا مقابلہ ہوگا اور انشاءاللہ مومن غالب آئیں گے۔

نواب شاہ، مرکزی جمعیت علمائے اسلام کے قائد اور ممتاز عالم دین مولانا احتشام الحق

صاحب تھانوی نے آج قائداعظم کو زبردست خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے دس کروڑ مسلمانوں کو سفید سامراج سے آزاد کرایا اور ہندو کے رام راج کی غلامی سے بچایا وہ مرکزی جمعیت علماء و نظام اسلام کے زیر اہتمام ایک جلسہ عام سے خطاب کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان کی بنیاد قومی نظریہ اسلام پر ہے وطن اور زبان پر نہیں اگر ہندو کانگریس کی وطنی ولسانی قومیت کا تصور قبول کر لیا جاتا تو دنیا کی کوئی طاقت برصغیر کے مسلمانوں کو ہندو کی غلامی سے نہیں بچا سکتی تھی مولانا نے کہا کہ تحریک پاکستان کے زمانہ میں قوم کے جن بچوں نے انگریز، ہندو اور سکھ قوم کے انسانیت سوز مظالم نہیں دیکھے اور جنھوں نے لاکھوں مسلمانوں کی تڑپتی ہوئی لاشوں اور ہزاروں مسلمان عورتوں کی لٹی ہوئی عصمتوں اور معصوموں کو نیزوں کی نوکوں پر لٹکے ہوئے نہیں دیکھا وہ آج پاکستان کی صحیح قدر و قیمت سے کیسے واقف ہو سکتے ہیں مولانا نے کہا کہ ملت مسلمہ کی قومیت صرف دین اسلام اور مذہب پر ہے وطنی و علاقائی تصور قومیت بظاہر خوش آئند ہے لیکن اسلام اور مسلمانوں، دونوں کے لئے انتہائی خطرناک اور تباہ کن ہے۔ انہوں نے کہا کہ قومیت کے اسلامی و دینی تصور کا یہ مطلب نہیں کہ علاقائی، لسانی اور قبائلی خصوصیات و روایات کے امتیاز کو فنا کر دیا جائے کیونکہ ایسا کرنا بھی فطرت سے جنگ کرنا ہے اس کے برعکس ان کی تہذیب و روایات کا احترام کرنا بھی اسلامی اخوت اور مذہبی قومیت کا تقاضا ہے انہوں نے کہا کہ آج سرحد بلوچستان میں غفار خاں کے سرخپوش سندھ کے جی ایم سید اور بنگال کے شیخ مجیب نے پاکستان میں وطنی قومیت کا فتنہ اٹھایا ہے اور یہ لوگ پاکستان کو ختم کرانا چاہتے ہیں۔

وہ مرا داخل زنداں ہونا

مولانا احتشام الحق تھانوی کا انٹرویو

مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب کبھی کسی حکومت میں نہیں رہے لیکن اس کے باوجود ان کی شخصیت بحیثیت ایک دینی پیشوا اور مذہبی رہنما کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کے

سیاسی نظریات خواہ کیسے بھی سہی لیکن ان کی خوش الحالی اور اس انداز بیان نے جو نہ صرف پاکستان بلکہ مشرق وسطی کے دور دراز علاقوں میں بھی اپنی اثر انگیزی سے بیشمار عقیدت مند پیدا کر چکا ہے، ان کی بے پناہ صلاحیتوں کو سامنے لا کھڑا کیا ہے۔

مولانا موصوف ایک عرصے سے جیکب لائنز میں رہائش پذیر ہیں وہ اس علاقے میں اس وقت سے ہیں جب یہاں کوئی وسیع وعریض مسجد نہیں ہوتی تھی جس میں بیک وقت ہزاروں مسلمان نماز ادا کر سکیں، لیکن آپ کی شبانہ روز سعی وکاوش نے چند ہی برسوں میں اس چھوٹی سی مسجد کی جگہ ایک ایسی عالی شان مسجد تعمیر کرا دی جس کو دیکھ کر دور مغلیہ کی بڑی بڑی مسجدوں کے نقشے ذہن میں گردش کر جاتے ہیں۔

مولانا کی دینی خدمات کے علاوہ سیاسی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے سیاست کے میدان کارزار میں آ کر جو کچھ بھی کیا وہ کچھ نہ ہونے کے باوجود بہت کچھ ہے آپ ان دنوں جمعیت علمائے پاکستان کے صدر ہیں۔

تھانوی صاحب کے بارے میں کسی دشمن نے یہ اڑا رکھی ہے کہ وہ پاکستان کے سابق صدر ایوب خان کے خاص مریدوں میں سے تھے اور وہ نہ صرف خان صاحب کی مزاج پرسی کے لئے عموماً ایوان صدر جایا کرتے تھے بلکہ سفر پر جانے سے پہلے اکثر ایوب خان کے بازو پر امام ضامن باندھ کر خیریت سے واپس آ جانے کی دعائیں بھی وہی مانگا کرتے تھے بہر حال ایوب خان کے زمانے میں مولانا کے موصوف سے کیسے مراسم تھے اس سے قطع نظر یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ مولانا کو اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ انہی خان صاحب کے دور میں سرکاری مہمان خانے بھی جانے کا اتفاق ہوا ہے۔

میں نے مولانا سے ان کے زنداں میں داخل ہونے کے سلسلے میں جو سوالات کئے ان کا تذکرہ یہاں اس لئے بے محل ہوگا کہ اگلی سطور میں آپ خود ان کی زبانی وہ حکایت پڑھ لیں گے جس کا لطف اسے ایک مسلسل واقعہ کی صورت میں پڑھنے سے آتا ہے نہ کہ سوالوں کے جواب سمجھ کر مطالعہ کرنے سے۔ تھانوی صاحب نے اپنے گرفتار ہونے کا ماجرہ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ۔

”جب کوئی نظام جمہوریت سے ہٹ کر آمریت کی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے تو پھر اس نظام

حکومت کو چلانے والے قدرتی طور پر ہر مسئلے پر دوسروں کی حدود اور ذمہ داریوں میں مداخلت کرنے لگتے ہیں ایوب خان کے زمانے میں ان کے ساتھیوں نے یہ سمجھ کر کہ رویت ہلال حکومت کا مسئلہ ہے اور یہ کام علماء کرام کے بجائے خود حکومت کو کرنا چاہیے حکومت کو اس بات پر اکسایا کہ وہ یہ کام علماء سے لے کر خود انجام دے اگر چہ یہ بات کسی حد تک صحیح بھی ہے کہ چاند ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ خود حکومت کو کرنا چاہیے لیکن اس سلسلے میں پھر حکومت پر دوسری ذمہ داریاں بھی عائد ہوجاتی ہیں لیکن بہر حال ایوب خان کے حواریوں نے ان ذمہ داریوں کو اہمیت نہ دیتے ہوئے ایک مرتبہ ۱۹۶۷ء میں ہمیں علماء کرام کو نظر انداز کر کے اپنے طور پر عید کا چاند نظر آ جانے کا اعلان کر دیا اور چاند نظر آ جانے کی دلیل یہ دی گئی کہ کوہاٹ میں کسی صاحب نے چاند دیکھ کر یہ اطلاع انہیں فراہم کی ہے حالانکہ درحقیقت واقعہ یہ تھا کہ اس روز برصغیر کے کسی بھی شہر میں چاند نظر نہیں آیا تھا مگر حکومت کہتی تھی کہ قبائلی علاقوں میں چاند ہو گیا ہے، چنانچہ چاند ہونے یا نہ ہونے کی اسی کشمکش میں مغربی اور مشرقی پاکستان کے تمام لوگ تین چار بجے تک جاگتے رہے ٹیلی فون پر اور ذاتی طور پر چاند ہونے کی تصدیق کرنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا میرے پاس رات تین بجے تک مشرقی پاکستان کے شہروں تک سے فون آتے رہے ان میں ایک ٹیلی فون مشرقی پاکستان کے سابق گورنر عبدالمنعم خان کا بھی تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ مولانا ہم کیا کریں؟ چاند تو واقعی نظر نہیں آیا ہے لیکن حکومت نے صبح عید منانے کا فیصلہ کر لیا ہے میں نے کہا آپ اپنے صدر سے پوچھئے کہ آپ کو کیا کرنا ہے اس پر منعم خان نے کہا کہ ”میں تو میمن سنگھ چلا جاتا ہوں تا کہ ڈھاکہ میں رہ کر عید ہی نہ منانی پڑے اس شام خصوصاً کراچی میں مطلع بالکل صاف تھا اس لئے یہاں کے لوگوں کو چاند نظر آ جانے کی سرکاری خبر فریب معلوم ہو رہی تھی جیکب لائینز جامع مسجد شہریوں کے بے پناہ ہجوم میں گھری ہوئی تھی اور ہر شخص چاند نظر آ جانے کے سلسلے میں اپنے طور پر تصدیق کرنے کا خواہشمند تھا۔ لہٰذا اس رات میں نے عوام کی آسانی کے لئے کاغذ کے ٹکڑوں پر یہ عبارت سائیکلو اسٹائل کرا کے آج چاند نہیں ہوا کل کا روزہ ہے بمعہ اپنے دستخط جامع مسجد جیکب لائینز سے جاری کرادی دوسرے دن حکومت کو جب

یہ پتہ چلا کہ عوام کی کثیر تعداد نے اس کی حکم عدولی کی ہے اور عید منانے کے بجائے روزہ رکھا ہے تو اسے اپنی اس ناکامی پر بڑا طیش آیا اور نتیجتاً ۲۹ فروری ۱۹۶۷ء کی رات ساڑھے بارہ بجے ڈی پی۔ آر ووڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت اس خاکسار کی گرفتاری کا پروانہ آ گیا۔

گرفتاری کے لمحات عموماً یادگار رہتے ہیں اور پھر ویسے بھی میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا اس رات جو صاحب میری گرفتار کے وارنٹ لے کر آئے وہ میرے ایک واقف کار ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے جس وقت مجھے ان کے آنے کی اطلاع ہوئی تو کچھ دیر کے لئے میں نے سوچا کہ یہ آخر اتنی رات گئے کیوں آئے ہیں بہر حال جب میں ان سے ملا تو مجھے بتایا گیا کہ ہم آپ کو لینے آئے ہیں میں نے ان کو برابر کے کمرے میں بٹھا کر کچھ سامان اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت چاہی۔

پولیس انسپکٹر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحبان نے اجازت دیتے ہوئے مجھ سے کہا کہ سامان تو خواہ آپ کچھ بھی لے لیں اس لئے کہ حکومت نے آپ کو ایک علیحدہ بنگلے میں رکھنے کا انتظام کیا ہے لیکن از راہ کرم اس وقت آپ اپنا ٹیلی فون استعمال نہ کیجئے گا میں بہت بہتر ہے کہہ کر اندر گیا گھر والے وقتی طور پر ظاہر ہے خاصے پریشان تھے خاص طور پر انہیں یہ تشویش تھی کہ حکومت کہیں مجھے کسی نامعلوم جگہ بھیج کر کوئی نقصان نہ پہنچائے خیر میں نے سرکاری مہمان خانے جانے کے لئے رخت سفر باندھا جس میں کتابوں کی تعداد زیادہ تھی اور گھر والوں کو خدا حافظ کہہ کر باہر آ گیا باہر آ کر دیکھا تو ایک پولیس کی وین اور ایک پرائیویٹ ٹیکسی میرے انتظار میں مبہوت کھڑی تھی ٹیکسی میں سوار ہونے سے پہلے مجھے بتایا گیا کہ مولانا علماء کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے پولیس وین میں لے جانے کے بجائے آپ کے لئے اس ٹیکسی کا انتظام کیا گیا ہے میں اس اہتمام کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان صاحبان کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھا دونوں گاڑیاں روانہ ہوئیں اور سب سے پہلے مجھے بریگیڈ تھانے لے جایا گیا جہاں پہنچ کر پتہ چلا کر مجھے پہلے سرکار کی طرف سے جاری کئے گئے چند کاغذات پر دستخط کرنے ہیں میں جیسے ہی اندر پہنچا مذکورہ کاغذات لائے گئے۔ ان کاغذات کی ابتدائی سطور پڑھنے کے بعد اس سے پہلے کہ میں تعمیل حکم کی اس سند پر دستخط کرتا میں نے

یہ کہہ کر ہاتھ روک لیا کہ ان کاغذات کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں آپ نے مجھے غلط گرفتار کیا ہے میرا نام مسٹر احتشام الحق نہیں بلکہ میں مولانا احتشام الحق ہوں۔ میری صحیح بات سن کر یہاں پر موجود ذمہ دار حضرات مسکرائے اور انہوں نے افسران بالا کی اجازت سے مسٹر کی جگہ مولانا کر کے مجھ سے دستخط کی درخواست کی ان کاغذات پر اپنا پورا نام لکھا دیکھ کر میں نے بلا حیل و حجت ان پر دستخط کر دیئے اس مرحلے سے گزر کر ہم آگے بڑھے اور دوسرے دن کوئٹہ کے قریب نوشکی نامی ایک مقام پر پہنچا دیئے گئے یہاں مقامی ڈپٹی کمشنر کے بنگلے کے برابر میں ایک اور بنگلہ تھا جس میں مجھے ٹھہرایا گیا یہ بنگلہ دراصل وہ ریسٹ ہاؤس تھا جس میں پہلے ایران زاہدان وغیرہ سے آنے والے مسافر ٹھہرا کرتے تھے میرے پہنچنے کے بعد یہاں پولیس گارڈ وغیرہ متعین کر دیئے گئے رات کو میں نے آرام کیا دوسرے دن نوشکی کے ڈپٹی کمشنر جو یہاں میرے پڑوسی بھی تھے میرے پاس آئے اور کہا مولانا آپ کے لئے ایک باورچی کا انتظام کیا گیا ہے اس سے آپ جو چاہیں پکوائیں اور ۳۵ روپے یومیہ آپ کا الاؤنس مقرر ہوا ہے میں نے اس کرم فرمائی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے موصوف سے کہا کہ بھائی پیسے تو میں اپنے ساتھ لایا ہوں آپ ناحق میرا الاؤنس مقرر کر کے مجھے شرمندہ کر رہے ہیں بہرحال وہ مسکرا کر چلے گئے میں مطالعہ میں مشغول ہو گیا۔

یہ قید جس کی مدت چھ ہفتے تھی اس پولیس افسر کے لئے بھی یادگار ثابت ہوئی ہوگی جو یہاں سے متعین پولیس کے سپاہیوں کو میرے پیچھے نماز نہ پڑھنے کی تاکیدیں کیا کرتا تھا لیکن اس کے ماتحت پولیس والے تھے کہ اس سلسلے میں اس کا کہنا ہی نہیں مانتے تھے وہ انہیں منع کرتا لیکن اس کے ماتحت سپاہی کبھی میرے لئے لوٹے میں پانی لاتے کبھی مجھے وضو کراتے ان میں کوئی میری جوتیاں اٹھاتا اور کوئی شریف النفس مجھے جرابیں پہنا کر میری خدمت کرتا ادھر کراچی میں جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ بچے وغیرہ کچھ پریشان تھے لہٰذا بعد میں مجھے معلوم ہوا مسعود بنی نور جو اس وقت ہوم سیکرٹری ہوا کرتے تھے، انہوں نے میرے بڑے لڑکے کو بتا دیا تھا کہ وہ گھر میں کہہ دیں کہ مولانا نوشکی میں خیریت سے ہیں یہ

اطلاع ملنے کے بعد گھر والوں کو اطمینان ہو گیا۔

داخل زنداں ہونے کے بعد میرے روز و شب اس لئے زیادہ اچھے گذرے کہ میں بہت سی کتابیں وغیرہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ کیونکہ سچی بات یہ ہے کہ میں اس قید کو چھ سال یا کم از کم چھ مہینے کی قید سمجھ رہا تھا مطالعہ کے علاوہ خطوط نویسی اور کوئٹہ سے شام کو آنے والے دوست احباب جن میں سرکاری اور غیر سرکاری لوگ شامل تھے اکثر ملامات کر کے احساس تنہائی مٹا جایا کرتے تھے ان لوگوں سے خاصی آزاد فضا میں گفتگو ہوا کرتی تھی اور وہ سب چاند کے معاملے میں ہمارے ہم خیال تھے۔

نوشکی کے اس زنداں میں رہ کر مجھے واقعی بڑا سکون ملا اور میں نے گھر کی نسبت وہاں قدرے زیادہ مطالعہ کیا چھ ہفتے کی اس مختصر لیکن طویل مدت میں میرے ساتھ پیش آنے والے واقعات میں ایک واقعہ جو قابل ذکر ہے وہ یہ تھا کہ میری لکھی ہوئی وہ ڈاک جسے میں ملفوف کر کے پوسٹ کرنے کے لئے باہر بھیجا کرتا تھا پوسٹ ہونے سے پہلے وہ تمام ڈاک ڈپٹی کمشنر موصوف پڑھتے تھے لیکن مجھے اس سنسر شپ کا علم نہیں تھا ایک دن ڈپٹی کمشنر صاحب افریقہ بھیجا جانے والا میرا تحریر کردہ ایک خط لے کر میرے پاس آئے اس سے پہلے کہ میں آپ کو یہ بتاؤں کہ انہوں نے اس خط کے بارے میں مجھ سے کیا کہا آپ کو اس خط کا پس منظر اور تفصیل بتانا ضروری سمجھتا ہوں، ہوا یوں کہ افریقہ کا ایک نیا ملک بچوانا لینڈ جس کا نام بعد میں تبدیل کر کے بوٹس وانا رکھ دیا گیا انہی دنوں رمضان میں آزاد ہوا تھا یہاں کے مسلمانوں نے ایک مسجد کے افتتاح کے لئے مجھے بوٹس وانا آنے دعوت دی تھی اس امر کی تکمیل کے لئے انہوں نے تاریخ وغیرہ طے کر کے مجھے بلانے کا ٹکٹ وغیرہ بھی بھیج دیا تھا اور طے یہ پایا کہ میں حج پر جانے کے بعد واپسی میں مسجد کا افتتاح کرنے کی غرض سے بوٹس وانا آؤں چنانچہ میں نے اپنی گرفتاری کا واقعہ پیش آنے کے بعد نوشکی کے اس قید خانے سے مذکورہ مسجد کے منتظمین کو ایک خط میں اطلاعاً یہ لکھا تھا چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں کہ مقررہ تاریخ کو یا تو کسی اور سے مسجد کا افتتاح کرا لیا جائے یا کچھ عرصے کے لئے یہ پروگرام ملتوی کر دیا

جائے کیونکہ فی الحال میں بوٹس وانا آنے سے قاصر ہوں ڈپٹی کمشنر موصوف میرا خط پڑھنے کے بعد میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ کیا آپ کو فلاں ملک میں فلاں تقریب کے سلسلے میں ان دنوں باہر جانا تھا میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ بولے اگر آپ کہیں تو ہم صدر مملکت جناب ایوب خاں کو آپ کی طرف سے اس بات کی اطلاع کر دیں یہ اطلاع پا کر ممکن ہے صدر مملکت آپ کو افریقہ جانے کی اجازت دے دیں میں نے ان صاحب کو اس کرم فرمائی سے روکتے ہوئے کہا کہ آپ ایسا نہ کریں میں نے اس افتتاحی تقریب کو رکوا دیا ہے اور بالفرض محال اگر میں چلا بھی گیا تو لوگ سمجھیں گے کہ مولانا حکومت سے معافی مانگ کر باہر آ گئے ہیں لہٰذا مجھے باہر جانے سے زیادہ اپنی قید کی مدت پوری کرنے کا شوق ہے۔

بہر کیف مختصر یہ کہ میری چھ ہفتے کی وہ مدت جسے آپ وہ مرا داخل زنداں ہونا کا عنوان دیں گے انہی حالات و واقعات میں گذر گئی، رہائی کے وقت مجھے اصرار کر کے ۳۵ روپے یومیہ کے حساب سے میرے الاؤنس کی وہ رقم مجھے دی گئی جو سرکار نے میرے نام کی تھی لیکن میں نے وہ روپے اپنے پاس رکھنے کے بجائے وہیں پولیس والوں میں تقسیم کر دیئے۔

ہر چند کے قید خانے میں میرے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا گیا اور مجھے کافی سے زیادہ سہولتیں دی گئیں لیکن اس سے قطع نظر ہمارے ملک میں سیاسی قیدیوں کے ساتھ آج بھی جو سلوک روا رکھا جاتا ہے وہ نہ صرف یہ کہ غیر جمہوری ہے بلکہ غیر انسانی بھی ہے جب کہ ہونا یہ چاہئے کہ اگر کسی شخص نے قانون شکنی کی ہے تو حکومت اس کے خلاف مقدمہ چلائے اور عدالت کے ذریعے اسے اسی جرم کی پاداش میں سزا دلوائے لیکن افسوس کہ ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا شاید یہی وجہ ہے کہ سیاسی قیدیوں کو رکھنے کے اس غلط طریقہ کار کی وجہ سے اپوزیشن کی طرف سے کی گئی مخالفت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر
ایک اہم انٹرویو

اَلحمدُ لِلّٰہِ نَحمَدُہٗ وَنَستَعِینُہٗ وَنَستَغفِرُہٗ وَنُؤمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیہِ وَنَعُوذُ بِاللّٰہِ مِن شُرُورِ اَنفُسِنَا وَمِن سَیِّاٰتِ اَعمَالِنَا مَن یَّھدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضلِلہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشھَدُ اَن لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحدَہٗ لَا شَرِیکَ لَہٗ وَنَشھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَولَانَا مُحَمَّدًا عَبدُہٗ وَرَسُولُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیرِ خَلقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصحٰبِہٖ اَجمَعِینَ.

اَمَّا بَعدُ! فَاَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ.

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ.

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد مولانا کا اس موضوع پر ایک اہم انٹرویو

آپ اور ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اس لئے خدارا کچھ کیجئے ورنہ آپ تو ڈوبیں گے ہمیں بھی لے ڈوبیں گے؟

یہ بات ممکن ہے انداز میں تھوڑا سا فرق ہو، مفہوم یہ تھا میرے استاد محترم ایڈیٹر چٹان آغا شورش کاشمیری نے مولانا احتشام الحق تھانوی سے ٹیلیفون پر ملاقات کا وقت لیتے ہوئے اس وقت کہی تھی جب آغا شورش ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے قبل اسلامی نظام کی داعی پارٹیوں کے قائدین سے ملاقات کے لئے کراچی تشریف لائے تھے اتفاق سے اس وقت آغا صاحب کے پاس میں بھی موجود تھا اور مولانا صاحب کا نمبر بھی میں نے ملایا تھا اور آج جب ملک ایک عظیم المیہ کا شکار ہونے کے باوجود سنبھل نہیں سکا اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ان رہنماؤں کے جذبات و احساسات کو سامنے لایا جائے جو سقوط مشرقی پاکستان سے قبل قوم کو اس خوفناک بحران سے آگاہ کرتے رہے لیکن کسی نے ان کی بات نہ سنی چنانچہ اسی سلسلے میں مولانا تھانوی کی خدمت میں حاضر ہوا تا کہ معلوم ہو سکے کہ اس خطرہ کی گھنٹی پر کیوں توجہ نہ دی گئی اس ملاقات میں جو غیر رسمی بات چیت ہوئی وہ سوالاً جواباً پیش کی جا رہی ہے۔ (جلیس)

سوال:۔ آج پاکستان دو حصوں میں بٹ چکا ہے اور دونوں پر دو مختلف پارٹیوں کی حکومت ہے کیا ان پارٹیوں یا حکومتوں سے توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ ملک میں اسلامی نظام قائم کریں گی؟

جواب:۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے الیکشن میں بارہا یہ اعلان کیا تھا کہ قرآن و سنت کے مطابق حکومت قائم کریں گے لیکن بھارت کی مدد سے جب وہ مشرقی پاکستان کو علیحدہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تو انہوں نے سیکولرازم کا اعلان کر دیا پچھلے دنوں اخبارات میں یہ خبر آئی تھی کہ مشرقی پاکستان میں قومی اسمبلی کا اجلاس گیتا سے شروع کیا گیا اس لئے شیخ مجیب الرحمٰن کے

رجحانات اور بھارت کے غالب اثرات کو دیکھتے ہوئے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ مشرقی پاکستان میں اسلامی نظام قائم ہوگا رہا مغربی پاکستان کا حصہ جہاں دو دو صوبوں میں دو مختلف پارٹیوں کی حکومت ہے ان کا نعرہ بھی اسلامی سوشلزم اور سیکولرازم تھا۔ جیسا کہ ابھی حال ہی میں بلوچستان کے گورنر سردار غوث بخش بزنجو اور خان عبدالولی خاں اپنے سیکولرازم کا اعلان کر چکے ہیں لیکن آج جب کہ حزب اختلاف و حزب اقتدار کے درمیان آئینی سمجھوتہ کے تحت آئین میں اسلامی دفعات شامل کرنے کا امکان پیدا ہوگیا ہے توقع کی جاسکتی ہے کہ مغربی حصہ میں اسلامی نظام پر مبنی حکومت قائم ہوسکتی ہے۔ بشرطیکہ ہم الفاظ کو عمل کی صورت میں ڈھال سکیں۔

سوال:۔ کیا ملک میں اسلامی نظام کے قیام کے خواہشمند حضرات کا یہ الزام درست نہیں کہ اسلامی نظام کی داعی پارٹیوں کو شکست ان کے سیاسی رہنماؤں بالخصوص دینی رہنماؤں کی ہوس اقتدار و شخصی انا کی وجہ سے ہوئی؟

جواب:۔ یہ حقیقت ہے کہ سوشلزم کی دعویدار جماعتوں کے مقابلے میں جب اسلام کی علمبردار جماعتوں نے اپنی انتخابی جدوجہد کا آغاز کیا تو دلائل کی حد تک انہوں نے سوشلزم کے خلاف میدان جیت لیا تھا لیکن سوشلسٹ امیدواروں کے مقابلے میں ان جماعتوں کے چھ چھ سات سات نمائندے کھڑے ہوئے اور اس کے لئے قدرتی طور پر کم ووٹوں سے سوشلسٹ امیدوار کامیاب ہوگئے اور زیادہ ووٹ حاصل کرنے کے باوجود یہ جماعتیں ناکام ہوگئیں اس کا باعث تمام جماعتوں کو قرار دینا شاید صحیح نہیں ہے کیونکہ جماعت اسلامی کے سوا باقی تمام جماعتیں سمجھوتہ اور اتفاق کی حامی تھیں میں نے براہ راست مولانا مودودی سے نوابزادہ نصر اللہ خان کی موجودگی میں کئی مرتبہ اس بات پر زور دیا کہ اسلام کی علمبردار جماعتوں کے امیدوار سمجھوتہ کے ساتھ کھڑے کئے جائیں تاکہ اسلام کے ووٹ آپس میں تقسیم نہ ہوجائیں لیکن اس مطالبہ کی معقولیت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی نہیں معلوم وہ کیوں کسی سمجھوتہ اور اتحاد پر تیار نہیں ہوئے البتہ ان کے ترجمان بعض ہفتہ وار اور ماہوار رسالوں کو پڑھنے سے یہ پتہ چلا کہ جماعت اسلامی کو اس بات کا یقین تھا کہ ملک میں سو فیصد سیٹیں انہیں ملیں گی اس لئے کسی پارٹی کے ساتھ اتحاد کرنا نہ صرف غیر ضروری سمجھتے تھے بلکہ وہ یہ

خیال کرتے تھے کہ اتحاد کا نعرہ لگانے والے ہمارا سہارا لے کر فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں بہرحال اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں اسلامی جماعتوں کی ناکامی بعض جماعتوں کی انانیت کا نتیجہ ہے اور میں اسے تاریخ کا سانحہ سمجھتا ہوں۔

سوال:۔ آپ کے بیان کے مطابق جماعت اسلامی خوش فہمی کا شکار تھی پھر اتحاد نہ ہوسکا تو کیا دوسری جماعتیں جماعت اسلامی کے تعاون کے بغیر متحد نہ ہوسکتی تھیں یا جماعت اسلامی ان کی راہ میں بھی روڑے اٹکاتی رہی ہے؟ میں نے مولانا سے ایک سوال اور کر دیا۔

جواب:۔ مولانا گویا ہوئے کہ "دراصل دوسری جماعتیں بھی اس کے پروپیگنڈے سے متاثر تھیں اور جب میں کہتا تھا کہ جماعت سے الگ رہ کر ہم آپس میں اتحاد کر لیتے ہیں اس پر کوئی جماعت تیار نہ ہوتی ہر جماعت کا رہنما یہ کہتا تھا کہ اتحاد جماعت اسلامی کے بغیر بیکار ہے اگر اتحاد کرنا ہی ہے تو جماعت اسلامی کے ساتھ کیا جائے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ جماعت اسلامی ہی پورے ملک میں کامیاب ہو رہی ہے اس سے اتحاد کرنے میں چند سیٹیں ہم کو بھی مل سکتی ہیں۔

سوال:۔ کیا اس پروپیگنڈہ سے آپ بھی متاثر ہوئے؟

جواب:۔ ہرگز نہیں مولانا نے جواب دیا میں نے اسی وقت کہہ دیا تھا دراصل جماعت اسلامی کو اس حکومت میں موجود ایک مرکزی وزیر نے خوش فہمی کا شکار کر دیا تھا کہ حکومت جماعت اسلامی ہی کی بنے گی یحییٰ خاں جماعت اسلامی ہی کو حکومت دے گا۔

سوال:۔ بعض حلقوں کی طرف سے یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ انتخابات ازسرنو کرائے جائیں اقتدار اس وقت تک کے لئے چیف جسٹس کو منتقل کر دیا جائے آپ کی اس کے متعلق کیا رائے ہے؟

جواب:۔ اس سلسلے میں اصل غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ آیا موجودہ حکومت کی تشکیل اور اسمبلی کی کارکردگی اصولی طور پر صحیح ہے کہ نہیں۔ یہ سوال سیاسی اور قانونی حلقوں کے لئے بہت اہم ہے کیونکہ الیکشن میں کوئی امیدوار اپنے حلقے سے کامیاب ہو اور اسی حلقے سے کوئی دوسرا امیدوار سیکنڈ پوزیشن لے تو پہلے امیدوار کے اچانک انتقال پر دوسرے امیدوار کو جائز رکن قرار نہیں دیا جا سکتا ہے میرا تیس سالہ تجربہ اور مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ دوسرے امیدوار کو اس لئے جائز رکن تسلیم نہیں کیا جائے گا کہ پہلے کے مقابلے میں سیکنڈ پوزیشن لی تھی اس

طرح اگر ملک کی کوئی پارٹی اکثریت حاصل کرے اور اس کے مقابلے میں کوئی پارٹی دوسری حیثیت حاصل کرلے اور کسی وجہ سے اکثریتی پارٹی سے معاملہ نہ ہو تو دوسری پارٹی کو ملک کی اکثریتی پارٹی قرار دے کر اس کے ساتھ پہلی پارٹی کی طرح معاملہ کرنا میرے نزدیک بالکل غیر اصولی ہے اس بناء پر اکثریتی پارٹی عوامی لیگ مغربی پاکستان سے الگ ہوگئی پیپلز پارٹی کو ملک کی اکثریتی پارٹی قرار دے کر اقتدار دے دینا جائز اور درست نہیں بلکہ اس کے لئے از سر نو الیکشن کی ضرورت ہے لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ اپوزیشن کی مختلف جماعتوں کے ارکان بھی اپنی موجودہ رکنیت کو بحال رکھنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے غیر اصولی طور پر دوسری پارٹی کو اکثریتی پارٹی تسلیم کرلیا۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد اکثریتی پارٹی کے تعین کے لئے دوبارہ الیکشن کی ضرورت تھی۔

سوال:۔ کیا آپ صدر بھٹو اور پارلیمانی لیڈروں کے درمیان ہونے والے آئینی سمجھوتہ سے مطمئن ہیں جن دفعات پر سمجھوتہ ہوا ہے ان سے ملک میں اسلامی نظام کے قیام اور جمہوری اقدار کی بحالی میں کس حد تک مدد مل سکتی ہے؟

جواب:۔ میں اس سلسلے میں ایک اخباری بیان کے ذریعہ اس سمجھوتہ کا خیر مقدم کر چکا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ سیاسی جمہوری اور اسلامی اعتبار سے بعض دفعات نہایت اہم اور وزنی ہیں جن پر اخلاص کے ساتھ عمل کیا گیا تو بلاشبہ اسلامی نظام کی عمارت قائم ہو سکتی ہے۔

سوال:۔ موجودہ حکومت نے صحافیوں اور صحافت کے بارے میں جو رویہ اختیار کر رکھا ہے کیا یہ ملک کی سالمیت کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے؟

جواب:۔ بھٹو صاحب کی حکومت نے صرف صحافیوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ ہر طبقہ کے ساتھ خواہ وہ مزدور ہو یا طالب علم جو رویہ اختیار کر رکھا ہے وہ غیر جمہوری اور غیر منصفانہ ہے اور ہر اس جماعت سے جو سوشلزم و کمیونزم کی علمبردار ہو یہ تمام ناانصافیاں بعید نہیں ہیں۔

سوال:۔ مشرقی پاکستان کے محبّ وطن عناصر پر قائم ہونے والے مقدمات کی دفاعی کمیٹی مغربی پاکستان میں آپ سربراہ ہیں اس کمیٹی کو مغربی پاکستان کے کون سے حضرات سے اور کس قسم کا تعاون درکار ہوگا؟

جواب:۔ اس کمیٹی کا اولین کام مسلمانوں کے ان جذبات کو ابھارنا ہے جو وہ محبت وطن غیر بنگالی اور بنگالی مسلمانوں کے بارے میں رکھتے ہیں یہ انتہائی بے حسی اور بے غیرتی ہے کہ جس علاقے کو ہم اب تک پاکستان کا حصہ قرار دیتے تھے اس پر بھارتی جارحیت کے بعد ان لوگوں کو جو اپنے وطن اور آزادی کا تحفظ کر رہے تھے مجرم اور "غدار" ثابت کیا جائے ہمارا فرض ہے کہ ہم ہر ممکن ذریعہ سے ان کی حب الوطنی کے جذبے کو نمایاں کریں۔ عالمی رائے عامہ کو ہموار کریں کہ بھارت یا مجیب حکومت اپنے ارادوں سے باز آجائیں اور آخر کار اس سلسلے میں ان لوگوں کے دفاع کے لئے بیرون ملک سے وکلاء کی خدمات حاصل کریں جو وہاں جا کر ان مقدمات کی پیروی کریں۔

سوال:۔ اگر دوبارہ انتخابات ہوتے ہیں تو آپ کی پارٹی اسلامی نظام کی داعی پارٹیوں سے اتحاد کر کے مشترکہ امیدوار کھڑا کرنا پسند کرے گی؟ آپ کہاں تک اس اتحاد کے خواہاں ہوں گے؟ اور وہ کون سی بنیادی غلطیاں ہیں جنہیں ان انتخابات میں دہرایا نہیں جانا چاہئیے۔

جواب:۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ملک وملت کے مفاد کی خاطر جماعتوں کی کثرت کو وحدت میں بدل سکیں تو یہ سب سے زیادہ مفید اور بہتر ہوگا لیکن اس کا امکان نہیں البتہ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تمام جماعتیں اپنی تنظیمی حیثیت برقرار رکھیں اور الیکشن کے لئے جوائنٹ پارلیمنٹری بورڈ بنائیں تاکہ محبّ اسلام جماعتوں کے امیدوار آپس میں نہ ٹکرائیں میں سمجھتا ہوں یہ نہایت آسان وقابل عمل منصوبہ ہے اور اسی طرح موجودہ حالات میں بھی اپوزیشن پارٹیاں متحد ہو کر جدوجہد کر سکتی اور اپنے مقاصد حاصل کر سکتی ہیں۔

مولانا احتشام الحق تھانوی کا ایک وضاحتی خط

مشرقی پاکستان کے پندرہ روزہ دورے سے واپسی پر آپ کا ملفوف مراسلہ اور اشتہار دونوں میری نظر سے گزرے۔ اس قسم کے کچھ اور خطوط بھی اس سے پہلے مجھے موصول ہوئے تھے۔ جن میں معاندانہ اور مفسدانہ انداز اختیار کیا گیا تھا اس لئے میں نے ان کو قابل خطاب نہیں سمجھا اور خاموشی اختیار کی لیکن آپ کی تحریر سے اخلاص اور ادب کا اندازہ کر کے میں نے مناسب سمجھا کہ آپ کو صورت حال سے مطلع کر دوں۔

اشتہار کے صفحہ ۳، صفحہ ۴ پر جو عبارتیں نقل کی گئی ہیں ان میں سے صفحہ ۴ کی عبارت کا تعلق مفتی محمد شفیع صاحب سے ہے اور میرے افکار و خیالات کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ البتہ صفحہ ۳ پر جو عبارت نقل کی گئی ہے وہ ''اخبار جہاں'' کے انٹرویو کا اقتباس ہے جس میں الفاظ اور عبارت انٹرویو کے ترتیب دینے والے صاحب کی ہے اور مفہوم تقریباً میرا ہے۔ الفاظ اور عبارت سے عام تاثر یہ ہوتا ہے کہ میں نے تحریک پاکستان سے اختلاف رکھنے والوں کو پاکستان دشمن قرار دیا جبکہ اس میں حضرت مدنیؒ جیسے اکابر امت بھی شامل تھے اور دوسرا تاثر یہ ہوتا ہے کہ میں اس مبینہ اختلاف کو آڑ بنا کر جمعیۃ علمائے اسلام، مغربی پاکستان کی مخالفت کرنا چاہتا ہوں حالانکہ یہ دونوں تاثرات نہ صرف یہ کہ بے اصل اور بے سرو پا ہیں بلکہ میری اپنی افتادِ طبع کے بھی خلاف ہیں اور اس عظمت و احترام کے منافی ہیں جو تحریک پاکستان کے مسئلہ میں اختلاف کے باوجود ان اکابر ملت کے لئے میرے دل میں ہمیشہ سے ہے۔

''اخبار جہاں کے انٹرویو کی صورت یہ ہوئی کہ ۱۲ جون بروز جمعرات صبح ۱۰ بجے اسلامیہ کالج کراچی میں طلبہ کی جانب سے سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک جلسہ تھا اور یہ تاریخ ایک ہفتہ پہلے سے میری ڈائری میں درج تھی۔

۱۱ر جون بروز بدھ صرف ایک روز پہلے ''اخبار جہاں'' کے دفتر سے فون آیا کہ اس کے نمائندے کل صبح انٹرویو کے لئے آنا چاہتے ہیں میں نے ڈائری کا پروگرام دیکھ کر بتا دیا کہ ۱۰ بجے مجھے اسلامیہ کالج کے جلسہ میں جانا ہے۔ اگر آپ آنا چاہیں تو صبح ۹ بجے آ جائیں لیکن اخبار جہاں کے نمائندے ساڑھے نو بجے کے بعد میرے پاس پہنچے انٹرویو دیتے ہوئے پندرہ بیس منٹ ہی گزرے تھے کہ اسلامیہ کالج کے طلبہ مجھے لینے کے لئے آ گئے میں نے اخبار جہاں کے نمائندے سے معذرت کی کہ دوسرے وقت آپ تشریف لائیں انٹرویو کا باقی حصہ میں مکمل کرا دوں گا مگر وہ نہیں مانے اور کہنے لگے آپ میرے چند سوالات کے جوابات ہاں یا نہ میں مختصراً دے دیجئے میں انہیں اپنے الفاظ میں پھیلا کر لکھ لوں گا چنانچہ ان سوالات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ جمعیۃ علماء اسلام مغربی پاکستان کے موجودہ عہدیدار کیا

پاکستان کی تحریک میں شامل تھے؟ میں نے جواب دیا کہ نہیں۔ بلکہ ان حضرات کو تحریک پاکستان سے اختلاف تھا اور اسی اختلاف کی بناء پر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے جمعیۃ علماء اسلام کی تشکیل فرمائی تھی دوسرا سوال یہ تھا کہ کیا مولانا شبیر احمد عثمانی کے ساتھی اور رفقاء کی یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ میدان میں آ کر نظریہ پاکستان کی حفاظت کریں میں نے جواب دیا بے شک یہ رفقاء کی ذمہ داری ہے اور مولانا ظفر احمد عثمانی جو مولانا شبیر احمد عثمانی کے قریبی اور ہم عصر ساتھی ہیں انہیں اس میں پہل کرنی چاہیئے یہ وہ مجمل جوابات ہیں جن کا پھیلاؤ انٹرویو ترتیب دینے والے صاحب نے اپنے الفاظ میں اور اپنی عبارت میں کیا غاصبانہ قبضہ'' کانگریسی علماء'' ''پاکستان دشمن'' وغیرہ جیسے الفاظ ۲۲ سال کے عرصے میں کبھی کسی نے میری زبان سے نہ سنے ہوں گے اور نہ میں ایسی تلخ گوئی کا عادی ہوں پھر میں ذاتی طور پر تحریک پاکستان سے اختلاف کو پاکستان دشمنی سے تعبیر کرنا پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ اسے پاکستان سے اختلاف یا تحریک پاکستان کی قیادت کرنے والوں سے اختلاف کہا جا سکتا ہے۔

اس کی وضاحت چاند کے مسئلہ میں نظر بندی سے رہائی کے بعد لاہور کے استقبالیہ میں کر چکا ہوں جس کی صدارت استاد العلماء حضرت مولانا رسول خان صاحب نے کی تھی اور اس میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب بھی شریک تھے اسی طرح کی وضاحت دو سال پہلے ڈیرہ غازی خان کی ایک تقریر میں بھی کر چکا ہوں جس کی بناء پر حضرت مدنی کے بعض متوسلین نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ میں اپنے خیالات ضبط تحریر میں لا کر شائع کرا دوں ''کانگریسی علماء'' اور قبضہ غاصبانہ الفاظ بھی میرے نہیں ہیں بلکہ مفہوم میرا ہے یعنی یہ کہ یہ حضرات تحریک پاکستان سے اختلاف رکھتے تھے۔ پھر پاکستان بننے کے بعد ان حضرات نے جمعیۃ علماء اسلام کی تنظیم کو اپنا لیا ہے۔ کانگریسی اور غیر کانگریسی علماء کی تفریق کو میں نے عین تحریک پاکستان کے زمانے میں بھی پسند نہیں کیا اس زمانے میں بھی زبان سے تو درکنار کانوں سے بھی ان بزرگوں کی برائی سننا دل گوارا نہیں کرتا حضرت مدنی اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاری مجھ پر جس قدر مہربان تھے اور میں جس قدر ان کا احترام کرتا تھا اس کا علم علماء کے طبقہ میں مولانا سعید احمد

اکبر آبادی مدیر برہان دہلی اور مولانا سید دلدار علی غازی پروفیسر سٹی کالج کراچی کو اچھی طرح ہے اور سرکاری ملازمین میں سے اس وقت صوفی غلام قادر صاحب ریٹائرڈ افسر وزارت خارجہ حکومت پاکستان حال مقیم کراچی اور جناب محمد افضل صاحب ڈپٹی سیکرٹری وزارت صنعت حکومت پاکستان حال مقیم کراچی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں۔

جمعیۃ علماء اسلام کے اجلاس منعقدہ ملتان میں اس امر کا اعلان کیا گیا تھا کہ اب پاکستان بن جانے کے بعد اسلامی خطوط پر اس کی تعمیر کا مسئلہ ہے لہٰذا کانگریسی اور غیر کانگریسی کا امتیاز ختم کر دینا چاہئیے حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری نے مجھے جمعیۃ علمائے اسلام کا ناظم اعلیٰ مقرر فرمایا تھا مگر میں نے بچند وجوہ کنارہ کشی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس لئے بار بار اصرار کے باوجود میں نے مولانا احمد علی صاحب لاہوری سے معذرت ظاہر کر کے معافی مانگ لی تھی اگر کانگریسی اور غیر کانگریسی کی تفریق میرے گوشہ خیال میں ہوتی تو دستوری نکات ترتیب دینے کے سلسلہ میں ہر مکتب فکر کے علماء کے اجتماع میں مولانا احمد علی صاحب لاہوری اور مولانا محمد علی صاحب جالندھری مولانا محمد یوسف صاحب بنوری اور مولانا مودودی صاحب کو کیوں شریک کرتا وہ اجتماع میری اور صرف میری رائے سے ہوا تھا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ تعمیر پاکستان کے مسئلہ میں کانگریسی اور غیر کانگریسی کا امتیاز کبھی میرے وہم وگمان میں بھی نہیں رہا۔

سابق صدر ایوب خان نے اپنی خانہ ساز کتاب میں پاکستان کی مخالفت کے سلسلہ میں جن کانگریسی علماء اور مولانا مودودی صاحب کا تذکرہ کیا ہے وہ بھی میری نظر میں خلاف واقعہ ہے اور بے بنیاد! جس کا اظہار میں نے بارہا اپنی تقریروں میں کیا ہے۔ کیونکہ کانگریسی علماء کا اختلاف جس فارمولے پر مبنی تھا وہ مسلمانوں کے مستقبل کے اعتبار سے مخلصانہ اور ان کے نقطہ نظر سے نیک نیتی سے متعلق تھا اور مولانا مودودی صاحب نے تحریک پاکستان کی جس قیادت پر عدم اعتمادی کا اظہار کیا تھا وہ بھی کچھ زیادہ غیر واقعی نہ تھا اور گر پاکستان قرآن وسنت کی حکومت قائم کرنے میں کامیاب نہ ہوا تو تحریک پاکستان سے اختلاف کے اسباب اور وجوہ غلط نہیں قرار دیئے جا سکتے البتہ اگر اسلامی حکومت کے نصب العین میں پاکستان کامیاب ہو جاتا

ہے تو تحریک پاکستان سے متعلق تمام اختلافات کو بے بنیاد غیر صحیح اور توہمات کا درجہ دیا جا سکتا ہے پھر غاصبانہ کا الزام میری طرف سے اس وقت صحیح ہوتا کہ میں جمعیۃ علماء اسلام کا دعویدار ہوتا حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری نے وصال سے قبل علالت کی حالت میں عمرہ کے لئے جاتے ہوئے غریب خانے پر تشریف لا کر فرمایا تھا کہ میری انتہائی خواہش ہے کہ آپ جمعیۃ علماء اسلام کو سنبھالیں میں نے اس وقت غایت ادب سے عرض کیا تھا جی بہتر ہے پھر مولانا غلام غوث ہزاروی اور مفتی محمود صاحب دونوں حضرات نے مولانا عبداللہ صاحب درخواستی کا استخارہ بیان کرتے ہوئے مجھے جمعیت علماء اسلام کے لئے فرمایا میں نے معذرت پیش کر دی تو ایسی صورت میں میری طرف سے قبضہ غاصبانہ کا الزام دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مجھے نہ کانگریسی علماء سے اختلاف ہے اور نہ جمعیت علماء اسلام کی موجودہ قیادت سے بلکہ اصل اختلاف اس عالمگیر اور اسلام کش فتنہ سے ہے جو کمیونزم اور سوشلزم کے نام سے ہمارے ملک میں سر اٹھا رہا ہے اور جمعیت علماء اسلام کے پلیٹ فارم سے یا اس کے اخبار ترجمان اسلام سے اسلامی سوشلزم کی پرفریب مگر مہلک اصطلاح اختیار کر کے اس فتنہ کی حمایت کی جا رہی ہے۔ جہاں جہاں اسلام پسند طبقوں نے اس طرح کا دھوکا کھایا ہے آج وہاں نہ وہ اسلام پسند موجود ہیں اور نہ وہاں اللہ کا نام لینے والا کوئی باقی ہے۔ اینگلو امریکی سامراج کے لائے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت اور معاشی انصاف اور عدل عمرانی کے قیام کے لئے اسلام کا لفظ اختیار کرنا کافی ووافی ہے اگر اس پر فریب اصطلاح پر کلی طور پر اجتناب نہ کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ ملحد و بے دین طبقہ اسلام کی آڑ لے کر ماوزے تنگ کا لادینی نظام قائم کر لے گا ہماری نظر میں یہ مسئلہ صرف پاکستان ہی کی موت وزیست کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس ملک کی اسلام کی بقاء اور عدم بقا کا مسئلہ بھی ہے اس لئے سوشلزم اور اسلامی سوشلزم کی مخالفت ہمارا ایمان ہے اور جس طرح سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جہاد کرنا فرض ہے اسی طرح سوشلزم اور اسلامی سوشلزم کے خلاف جہاد کرنا بھی وقت کا سب سے بڑا فریضہ ہے اس فتنہ کی سرپرستی خواہ کوئی فرد کرے یا کوئی جماعت اور گروہ، دیوبندی، بریلوی، شیعہ، سنی، مقلد اور اہل حدیث سب کو مل کر اس لادینی فتنہ کی مخالفت اور اس کے خلاف جہاد کرنا ناگزیر اور ضروری ہے۔

اخلاقی زوال کا سد باب

کسی معاشرہ میں اخلاق و کردار کے زوال کا بنیادی سبب صرف اور صرف دین اسلام سے یکسر انحراف اللہ رب العزت کے عطا کردہ قوانین وضوابط اور احکام کی خلاف ورزی ہے اخلاقی عوارض اس وقت جنم لیتے ہیں۔ جب کوئی معاشرہ اللہ کے عطا کئے گئے سرچشمہ ہدایت سے انحراف کر کے خود ساختہ معاشی و معاشرتی قوانین وضوابط کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیتا ہے۔

ہمارے اخلاق و کردار کے زوال میں مغربی تہذیب کی اندھا دھند تقلید بھی کارفرما ہے۔ اسلامی نظام زندگی کو چھوڑ کر خود ساختہ قوانین پر چلنے سے ہمارا معاشرہ کبھی اسلامی نہ بن سکے گا۔ کیونکہ یہ دین فطرت ہے جو ایک انسان کی تمام تر ضروریات زندگی پر محیط ہے اپنے ماننے والوں کو سکون قلب عطاء کرتا ہے اور جب ہر شخص کو سکون قلب میسر ہو تو ظاہر ہے معاشرتی کمزوریاں (جیسے چغلی، ریاکاری، بڑوں کا ادب اور چھوٹوں سے پیار کا فقدان، مفاد پرستانہ حربے وغیرہ) جنم نہیں لیں گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر آدمی میں ذاتی اخلاق اور اجتماعی مفاد جیسی صنعات ذاتی خود بخود پیدا ہوتی چلی جائیں گی۔ ہمارے اخلاق و کردار کے زوال میں جنسی بے راہ روی، قوم پرستی و شخصیت پرستی، مذہب و اخلاق کا مکمل خاتمہ، کتاب وسنت سے ناآشنائی اور دوری، سرمایہ دارانہ نظام، معاشرہ میں مفاد پرستانہ حربے، بدعات اور فضول رسموں کی بھرمار، بے روزگاری، مزدور کی مظلومیت اور برطانوی سامراجی نظام تعلیم جیسی بیماریاں کارفرما ہیں۔

ان مذکورہ سماجی، معاشی، معاشرتی برائیوں کا خاتمہ ہوگا تو اخلاق و کردار کی آبیاری ہو گی۔ بداخلاقی و کردار کشی کا سد باب کرنے کے لئے صرف اور صرف نظام ربوبیت ہی ہے جسے نافذ کر کے ہم اخلاقی برائیوں سے بچ سکتے ہیں۔ ایک اسلامی معاشرہ کے قیام کے لئے یہ انتہائی ناگزیر ہے کہ قانون کی بالادستی اور قانونی مساوات ہو معاشرہ کے ہر فرد کی جان، مال اور آبرو کا مکمل تحفظ ہو منکرات کا انسداد حدود اللہ کا مکمل نفاذ ہو۔ ہماری نوجوان نسل میں اکثر ذہن ایسے ہیں جو اپنے اسلاف کے کارناموں سے بے خبر، نادانستہ، یا دانستہ مغربی تہذیب اور نظریات سے متاثر ہیں ضرورت ہے کہ ایسے نوجوانوں کو دین اسلام کے عقائد و

نظریات سے روشناس کرایا جائے اور انہیں ان اسلاف کی تعلیمات سے متعارف کرایا جائے اور خود غرضی یعنی انسان اپنی ذاتی ضرورتوں کے ماورائے قومی مفادات یا عالمگیر انسانیت کی بھلائی کے لئے آمادہ نہیں ہوتا۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ معاشی رو یہ از قسم دولت جو کچھ بھی موجود ہے صرف اسی کے قبضے میں آجائے۔ خواہ اس کے لئے ناجائز ذرائع ہی کیوں نہ اختیار کرنے پڑیں۔ اسے اپنی نجات سمجھتا ہے لیکن حسن اخلاق، سچائی پاس عہد، رحم، فیاضی، صبر و شکر، تحمل و بردباری، اولوالعزمی و شجاعت ضبط نفس و خودداری، شائستگی و فرض شناسی، اتفاق و اتحاد اور عدل و انصاف جیسی جملہ صفات و محاسن کو اپنا اوڑھنا بچھونا نہ بنالیا جائے اخلاقی اقدار کا فقدان رہے گا۔ جس معاشرہ میں ناخواندگی کے باعث جاہل اور غیر مستعد افراد کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا رہے۔ وہاں نہ تو ترقیاتی کاموں کا شعور باقی رہے گا اور نہ ہی وہ ایک دوسرے کے ساتھ اخلاق سے پیش آسکیں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں کا معاشرتی کردار دن بدن گرتا جائے گا اور معاشرہ قحط الرجال کا شکار ہو جائے گا۔ معاشرہ کی پستی کے سدباب کے لئے ضروری ہے کہ ناخواندگی اور جہالت کی شرح کو ختم کیا جائے۔

فضول رسوم، پیدائش، شادی اور موت کے وقت فضول رسوم ورواج بھی اخلاقی قدروں کے زوال کا سبب بنتے ہیں کیونکہ رسم ورواج پر فضول خرچی کرنا پرلے درجے کی جہالت ہی نہیں بلکہ اعلیٰ درجے کی حماقت بھی ہے۔ شادی بیاہ، تقریبات اور تہواروں پر زر کا بے دریغ استعمال معاشرتی بدحالی کا سبب بنتا ہے۔ اور جب معاشرتی بدحالی ہوگی تو ظاہر ہے لوگ پیٹ پوجا کے لئے ناجائز ذرائع بھی استعمال کریں گے۔ ترقیاتی کاموں کی بجائے غیر ترقیاتی کاموں میں دولت ضائع کرنا بہت برا کردار ہے۔ خدمت خلق کا جذبہ جب جاگزیں ہو جائے اور ایمان والوں کا دائرہ وسیع ہو جائے تو نظام معیشت میں بہتری ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ جب نظام معیشت بہتر ہوگا تو مال و دولت کے نظام میں اصلاح قرض حسنہ کا نظام رائج اور ذخیرہ اندوزی کا خاتمہ ہوگا۔ معاشرہ میں دولت کی گردش ہوگی۔ محنت کشوں کو صحیح اور بروقت معاوضہ ملے گا۔ اور یوں معاشرہ کے ہر فرد کو سکون قلب میسر ہوگا۔ اور جب سکون قلب مل گیا تو کوئی بھی فرد

دوسرے فرد سے زیادتی، بداخلاقی و بدکرداری سے پیش نہیں آئے گا۔ کسی معاشرہ کے اخلاق و کردار کی پستی کا سبب اس معاشرے میں رہنے والوں کی آپس میں باہمی عداوت، کشت و خون، غنڈہ گردی، بے رحمی وزیادتی، خیانت، وعدہ خلافی، زبان درازی وسرکشی، تکبر اور اجڈ پن ہے یہ معاشرتی کمزوریاں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب وہ معاشرہ اطیعوااللہ واطیعوا الرسول سے یکسر منحرف ہوکر کوئی اور نجات کی راہ سمجھ بیٹھتا ہے۔

معاشرہ میں اخلاق کی قدریں تب ہی فروغ پائیں گی۔ جب اس معاشرہ میں خدمت خلق کا وسیع تصور پیش کیا جائے۔ رفاہی کاموں کی ترغیب دی جائے برائی کا مکمل انسداد بمطابق فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پہلے زبان سے پھر ہاتھ سے اور پھر نفرت کے ذریعے کیا جائے گا۔ نیکی کی اشاعت، حاجتمند کی حاجت برآری دوسروں کی تکلیف پر بے چینی، تنگ دست کی مدد کا جذبہ کارفرما ہوگا تو اخلاق حسنہ کو فروغ ملے گا۔ پردہ پوشی ایک دوسرے کے ساتھ جائز تعاون، صدقہ وانفاق کی ترویج، حسن سلوک، معاملات دنیوی ودینی سنجیدگی اور نرمی سے سلجھانا وغیرہ ایسی صفات ہیں جو ایک معاشرے کو صحیح اسلامی معاشرہ بنادیتی ہیں اور اخلاق وکردار کی تعمیر کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اولاد کی تربیت اولاد کو حسن ادب کی تلقین اور انہیں کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، چلنے پھرنے میں اسوۂ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے روشناس کرانا اسلامی معاشرہ کی پختگی اور اخلاقی کردار کی تعمیر میں بے حد ممد ومعاون ثابت ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں رشوت کا ناسور جڑیں پکڑ چکا ہے۔ رشوت کی وباء دن بدن بڑھتی چلی جارہی ہے۔ ارشاد نبویؐ ہے'' رشوت لینے والا وار رشوت دینے والا دونوں دوزخ میں جائیں گے۔ اسلام کا یہ قانون معاشرہ میں رشوت جیسی لعنت کو ختم کرنے کے لئے بنایا گیا اور معاشرے کی اصلاح اور اسے رشوت جیسی بیماری سے پاک رکھنے کے لئے فعل بد سے ڈرایا گیا تاکہ یہ بندۂ خدا دنیا میں ایک دوسرے کے ساتھ رشوت کے ذریعے زیادتی کرکے رب جلیل کے دردناک عذاب کا مستحق نہ ہوجائے۔

ہمارے اخلاق وکردار کو تباہ کرنے میں برطانوی سامراج نظام تعلیم کا حصہ بھی پورا پورا ہے۔ اس غیر اسلامی نظام تعلیم پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ اقبال مرحوم نے فرمایا ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدائے لا الہ الا اللہ

نظام تعلیم کسی تہذیب کے صحت مند ارتقاء اور نشو ونما کے لئے ضروری ہے۔ اسلام کا نظام تعلیم ایسا نظام ہے جو نسلوں کی اخلاقی، ذہنی اور جسمانی نشو ونما بھی کرتا ہے اور اسلامی تہذیب وتمدن میں تعلیم کے بنیادی مقصد کی بجا آوری اور انسانوں کو اس مشن اور مقصد کی تعلیم دینا ان میں اس مذہب کی سچی روح پیدا کرنا اور انہیں ایک مکمل اور صحت مند زندگی کے لئے تیار کرنا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اور معاشرہ میں اخلاق وکردار کی بہتری کے لئے یہ لازم ہوگا کہ تعلیم کے ہر شعبہ میں اسلامی نظریہ حیات کی روح جاری وساری ہو۔

بنگلہ دیش ملک نہیں تحریک ہے

مشرقی پاکستان کے سقوط کے بعد اس سوال کا پیدا ہونا قدرتی امر تھا کہ بھارتی جارحیت کے ذریعہ جنم لینے والے "بنگلہ دیش" کو آیا پاکستان تسلیم کرے یا نہ کرے! پھر جب سے دنیا کی بڑی طاقتوں نے اپنے اپنے مفاد کی خاطر اس مسئلہ میں مداخلت اور دباؤ کے طریقے اختیار کئے اس وقت سے اس بحث میں کافی گرما گرمی پیدا ہوگئی ہے اور اب یہ مسئلہ ملک کا صرف اندرونی معاملہ نہیں رہا بلکہ امور خارجہ کے مسائل میں سے بھی ایک اہم مسئلہ بن گیا ہے۔

بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے حق میں زیادہ تر وہ عناصر پیش پیش ہیں جو یا تو ابتداء ہی سے تحریک پاکستان اور دوقومی نظریہ کے خلاف تھے اور اب پاکستان کی زبوں حالی سے فائدہ اٹھا کر اس کی نظریاتی بساط کو بالکل الٹ دینا چاہتے ہیں اور یا وہ نوخیز نسل حمایت میں ہے جس کو نہ آزادی ہند کی تاریخ اور تحریک پاکستان کے بارے میں خبر ہے اور نہ وہ نظریہ پاکستان کی ابجد سے واقف ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں طبقے اپنی روش میں معذور ہونے کے باوجود افہام وتفہیم کے دائرے سے باہر نہیں ہیں۔ البتہ مفاد پرست ہرجائیوں کا وہ ٹولا جو حقائق ونتائج سے قصداً آنکھیں بند کر کے اقتدار وقت کی پیشہ ورانہ حمایت کا عادی ہے وہ غیر مکلّف بھی ہے اور افہام وتفہیم سے بے نیاز بھی۔

بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے خلاف عام طور پر وہ محب وطن عناصر ہیں جنہوں نے دو قومی نظریہ پاکستان کی تحریک کو تاریخ کی عظیم قربانیوں کے ذریعہ پروان چڑھایا اور ایک عظیم اسلامی ملک کے قیام سے دس کروڑ مسلمانوں کو ہندو کی غلامی سے نجات دلائی اور اب وہ بنگلہ دیش کی حقیقت کو اور اس کے تسلیم کرنے کے تباہ کن نتائج کو بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

اس بحث کے تمام مفید و مضر پہلوؤں کو سمجھ کر کسی معقول نتیجے پر پہنچنے کے لئے سب سے پہلے پاکستان اور بنگلہ دیش کا اصولی جائزہ لینا ضروری ہے کہ آیا یہ دونوں نسلی و جغرافیائی اور لسانی ملک ہیں۔ یا مخصوص تصورات وافکار نے انہیں جنم دیا ہے اور وہ کسی تحریک کا مظہر اور نشان ہیں۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے ۱۹۴۷ء سے قبل جغرافیائی یا لسانی و نسلی اعتبار سے اس کا کہیں وجود نہ تھا۔ جب آزادی ہند کی تحریک کے نتیجے میں برطانوی اقتدار کی گرفت ڈھیلی ہو گئی اور آزادی کی منزل قریب سے نظر آنے لگی تو تیس کروڑ ہندوؤں کی واحد نمائندہ جماعت کانگریس نے دس کروڑ مسلمانوں کو ہندو کا غلام بنانے کے لئے منصوبہ تیار کیا اور یورپ کے وطنی قومیت والے تصور کی آڑ لے کر یہ دعویٰ کیا کہ ہندوستان ایک ملک ہے۔ اس میں بسنے والے جملہ اہل مذاہب ایک قوم ہیں جن کا نام "ہندو" ہے۔ گویا عیسائی، سکھ، پارسی، ہندو اور مسلمان بہ حیثیت وطنی قومیت کے سب ہندو ہیں۔ اس کا نام متحدہ قومیت رکھا گیا تھا۔ مسلمان رہنماؤں نے عموماً اور قائداعظم نے خصوصاً مسلمان کے خلاف ہندو کی سازش کو بھانپ لیا کہ یہ وطنی متحدہ قومیت کا جال صرف اس لئے بچھایا گیا ہے کہ جب ہندوستان برطانیہ کی غلامی سے آزاد ہو تو وہ آزادی صرف ہندو قوم کی نمائندہ تنظیم کانگریس کو ملے اور مسلمان قوم انگریز کی غلامی سے نکل کر ہندو کی غلامی میں آجائے اور یہ کوئی خیالی اور فرضی خطرہ نہیں تھا بلکہ مسلمان کی قومی حیثیت اور اس کی قومی خصوصیات کو فنا کرنے کے لئے نمستے کا سلام، اور بندے ماترم کا مشترکہ گیت مسلمانوں پر جبری طور پر مسلط کیا جائے لگا دیا مندرا اسکیم کا تعلیمی منصوبہ مسلمانوں کو ذہنی طور پر مرتد بنانے کے لئے تیار کیا گیا تھا اور رفتہ رفتہ مسلمانوں میں دھوتی، جواہر کٹ بنڈی، گاندھی کیپ، سبھاش بابو ٹائپ کا کرتہ اور

بہت سی ہندوانہ خصوصیات رواج پانے لگی تھیں۔

ان حالات سے جب مسلمانوں کے خلاف ہندو اور انگریز دونوں کے ناپاک عزائم کا پورے طور پر اندازہ ہو گیا تو وطنی متحدہ قومیت کے جال سے مسلمانوں کو نکالنے کے لئے قائداعظم مرحوم نے وطنی قومیت کے فرنگی تصور کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اسلام کے مذہبی تصور قومیت کو بنیاد بنا کر ٹو نیشنز تھیوری کا نعرہ لگایا۔ اور وطنی و لسانی امتیازات سے بلند ہو کر مسلم قوم کے لئے ایک مذہبی وطن کا مطالبہ کیا جس کا نام پاکستان تجویز ہوا۔ مختلف صوبوں کے رہنے والے اور مختلف زبانوں کے بولنے والے مسلمانوں نے صرف مذہبی قومیت کی بنیاد پر پاکستان کے لئے ووٹ دیا اور یہی نہیں کہ صرف مسلمانوں نے صوبائی و لسانی فرق کے باوجود مذہب کی بنیاد پر خود کو ایک قوم ثابت کیا بلکہ ہندو قوم نے بھی صوبائی و لسانی اتحاد کے باوجود صرف مذہبی امتیاز کی بناء پر مسلمانوں کو قتل کر کے ثابت کر دیا کہ قومی وحدت کی بنیاد وطن و زبان نہیں ہے بلکہ عقیدہ و مذہب ہے۔

کیا مشرقی پنجاب کے ہندو، سکھ اور مسلمان ایک ہی صوبہ پنجاب کے رہنے والے اور ایک ہی زبان پنجابی بولنے والے نہیں تھے؟ مگر ہندو اور سکھ نے پنجابی بولنے والے مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کیا وہ ایک غیرت مند قوم کے لئے ناقابل فراموش حادثہ ہے۔ کیا یوپی کے ہندو نے یوپی کے مسلمانوں کے خون کے ساتھ گڑھ مکیشر جبل پور اور شاہجہاں پور میں ہولی نہیں کھیلی؟ جبکہ دونوں ایک ہی صوبے کے رہنے والے اور ایک ہی زبان کے بولنے والے تھے۔ کیا نواکھالی اور کلکتہ کے ہندوؤں نے نواکھالی کے مسلمانوں کو قتل نہیں کیا؟ حالانکہ ان کا صوبہ بھی ایک ہے اور زبان بھی ایک۔ کیا احمد آباد و گجرات میں ہندوؤں نے مسلمانوں کا بے دریغ خون نہیں بہایا؟ جبکہ دونوں کی زبان بھی گجراتی تھی۔

ان حقائق و شواہد سے یہ بات صاف ہو گئی کہ پاکستان نہ جغرافیائی ملک ہے نہ لسانی بلکہ وطنی و لسانی قومیت کے خلاف جہاد کر کے صرف مذہبی قومیت کی بنیاد پر وجود میں آیا ہے۔ گویا پاکستان مختلف اللسان طبقوں اور مختلف علاقوں کے اس مجموعے اور وحدت کا نام ہے جس کو مذہبی قومیت

کے رشتے نے ایک کر دیا ہے۔ اور جس کا مقصد اسلامی نظام کا قائم کرنا ہے۔ مذہبی قومیت کے اسی تصور وحدت کا نام دو قومی نظریہ اسلام اور نظریہ پاکستان ہے۔ مذہبی قومیت کا یہ تصور مسلمانوں کا بنیادی عقیدہ ہونے کی وجہ سے اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود اسلام اور اسلام کی تعلیمات قدیم ہیں۔

مگر اس کو نظریہ پاکستان نام اس لئے دیا گیا کہ ہندو اور انگریز کے گٹھ جوڑ نے دس کروڑ مسلمانوں کو غلام بنانے کے لئے وطن کی متحدہ قومیت کا جو جال بچھایا تھا اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے اسلام کی اسی مذہبی قومیت کا سہارا لیا گیا اور اسی قدیم عقیدہ اسلام کی بنیاد پر ہندو اور انگریز دونوں کو شکست دے کر پاکستان حاصل کیا گیا۔ نظریہ پاکستان کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ پاسکتان نے اس تصور قومیت کو جنم دیا ہے بلکہ اس اسلامی تصور قومیت نے پاکستان کو جنم دیا ہے۔

مذہبی قومیت کا عقیدہ پاکستان سے پہلے بھی تھا اور خدانخواستہ پاکستان نہ رہے، تب بھی یہ عقیدہ ہمارے ایمان کا جزہے۔ اگر پاکستان کی سرزمین پر یا پاکستان کے کسی حصہ میں مذہبی قومیت کے تقاضے پر عمل درآمد نہ ہو رہا ہو تو اس کو اسلام کی خلاف ورزی، گناہ اور ارباب اقتدار کی نااہلی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس کو عقیدہ اسلام یا نظریہ پاکستان کی ناکامی نہیں کہا جا سکتا۔ کیا مسلمانوں کی موجودہ غیر اسلامی اور فسق و فجور کی عام زندگی سے قرآن کریم پر یہ الزام عائد کیا جا سکتا ہے کہ وہ ناکام اور فیل ہو گیا؟ لہٰذا پاکستان جس نظریہ قومی پر بنا ہے وہ ہمارا اسلامی عقیدہ اور مذہبی اصول ہے۔ حالات و وقت کے ساتھ ساتھ ملکی سرحدوں میں تبدیلی ہو سکتی ہے، مگر نظریہ قومیت میں سرمو تبدیلی ممکن نہیں ہے پس جو ملک وطنی و لسانی قومیت کے خلاف جنگ کر کے صرف مذہبی قومیت کی اساس پر وجود میں آیا ہو اس سرزمین پر وطنی یا لسانی قومیت کا نعرہ لگانا ایسا ہی متضاد ہے جیسا کہ گہوارۂ توحید میں بتوں کو پکارنا۔

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

یہاں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مذہبی قومیت کی جس نازک بنیاد پر پاکستان حاصل ہوا تھا اس پر غاصبانہ قبضہ جمانے والے ارباب اقتدار نے دیدہ و دانستہ یہ سمجھ کر مذہبی قومیت کے جذبے کو پس پشت ڈال دیا کہ مذہبی قومیت کے جس اصول سے ہم

نے وطنی متحدہ قومیت کے مقابلے میں پاکستان کی جنگ جیتی ہے وہ ایک موثر مگر وقتی ہتھیار تھا۔اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

چنانچہ جوں جوں مذہبی گرفت ڈھیلی ہوتی چلی گئی مذہبی قومیت کے نقوش بھی دھندلے پڑتے گئے۔اور غیر مذہبی افکار وخیالات کے ساتھ ساتھ اسلامی تصور قومیت کی بنیادیں بھی بدلنے لگیں اور پورے ملک میں کھلم کھلا وطنی اور لسانی قومیت کا پرچار ہونے لگا۔وطنی متحدہ قومیت کے علمبردار کانگریسی اور نیشنلسٹ مسلمانوں نے بھارت کے جاسوس ہندوؤں نے اور بڑی طاقتوں کے ایجنٹوں نے اس کی خوب سرپرستی کی،جس کے نتیجے میں نظریہ پاکستان کے خلاف جئے سندھ، پختونستان اور بنگلہ دیش کے نام سے تحریکیں اٹھیں اور بالآخر مشرقی پاکستان سے ہمیں محروم ہونا پڑا۔

سطور بالا سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ بنگلہ دیش کا نام کوئی ملک نہ تقسیم ہند سے پہلے موجود تھا اور نہ تقسیم ہند کے بعد اس کا نام ونشان ملتا ہے۔بلکہ پاکستان حکمرانوں کے اسلامی دشمنی اور نظریہ پاکستان کے خلاف بنگالی ہندوؤں کی سازش نے مسلم بنگال یعنی مشرقی پاکستان میں لسانی قومیت کا فتنہ کھڑا کیا۔بنگالی کو ملک کی سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ کیا اور مطالبہ کی شدت سے مرعوب ہو کر بعض نظریہ پاکستان کے حامی مسلمان بنگالی لیڈروں نے بھی اس مطالبہ کی سرپرستی کی حالانکہ اصل مسئلہ زبان کا نہ تھا بلکہ مذہبی قومیت والے نظریہ پاکستان کی جڑوں کو اکھاڑنا تھا۔

چنانچہ بنگلہ نوازی کے پردہ میں بنگالی ہندوؤں سے ہمدردی اور مغربی پاکستان کے مسلمانوں سے بلکہ ہر اردو بولنے والے مسلمان سے دشمنی اور بیزاری بڑھتی چلی گئی اور بعد میں کھلم کھلا نظریہ پاکستان والی مذہبی قومیت کو دفن کر کے لسانی قومیت کا بت کھڑا کیا گیا۔ گویا اخوۃ و بھائی بندی اور قومیت کی بنیاد اسلام نہیں رہی بلکہ قومیت کی بنیاد بنگلہ زبان ہے۔ یعنی بنگلہ بولنے والے ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں اور غیر بنگلہ بولنے والے مسلمان بنگلہ بولنے والے مسلمانوں کے لئے قومیت سے خارج اور غیر ہیں۔

مشرقی بنگال میں ہندو کی بڑی تعداد ہونے کی وجہ سے بھارت کے لئے لسانی قومیت

کے فتنے کو ہوا دینا صرف یہی نہیں کہ آسان تھا بلکہ پاکستان اور نظریہ پاکستان کو ختم کرنے کی سب سے زیادہ مؤثر تدبیر بھی یہی تھی کہ لسانی قومیت کے ذریعہ مذہبی قومیت کی بنیادوں کو اکھاڑ پھینکا جائے۔ چنانچہ بھارت کی کھلی جارحیت نے بنگلہ دیش کو قائم کر دیا۔

بنگالی مسلمانوں کے ہاتھوں اردو بولنے والے اور بہاری مسلمانوں کو قتل کرا کے بھارت نے دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ مذہبی قومیت کا اسلامی تصور نا قابل عمل اور ناکام ہے! اور اس بنیاد پر سرے سے ملک کی تقسیم ہی غلط ہوئی ہے۔ اس پس منظر میں بنگلہ دیش کی حقیقت کسی ملک اور کسی ریاست کی نہیں ہے، بلکہ نظریہ پاکستان والی مذہبی......قومیت کے خلاف بھارت کے ایماں پر اٹھائی جانے والی لسانی قومیت کی تحریک کا شاہکار ہے۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بنگلہ دیش سندھ و پنجاب اور بلوچستان کی طرح کا ایک نام ہے، وہ سخت دھوکے میں ہیں اور دوسروں کو بھی دھوکے میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ سندھ، پنجاب اور بلوچستان اس عہد اور دور کے رکھے ہوئے نام ہیں جب مذہبی قومیت کی تحریک نے ان علاقوں کو ایک وحدت میں تبدیل نہیں کیا تھا اور ان ناموں کے ذریعہ وحدت کی بنیاد کو پاش پاش کرنا مقصود نہیں تھا۔ یہاں تک کہ جب سندھ میں ۱۹۴۰ء سے وحدت ملی اور مذہبی قومیت کی تحریک شروع ہوئی تو ان علاقوں کے مسلمانوں نے علاقوں کے امتیازی ناموں کے باوجود مذہبی قومیت کی زبردست حمایت کی۔ یہاں تک کہ سندھ و بلوچستان اور سرحد و پنجاب کے ہم زبان ہندوؤں کو ان علاقوں کو خیر باد کہنا پڑا گویا مذہبی قومیت کی تحریک کو ختم کرنے کی خاطر نہ یہ نام رکھے گئے اور نہ یہ نام مذہبی قومیت کی راہ میں رکاوٹ بنے۔ بخلاف بنگلہ دیش کے کہ وہ علاقہ مشرقی بنگال کے نام سے موسوم تھا یا مشرقی پاکستان کے نام سے۔ اب دو قومی نظریہ پاکستان کا خون کرنے کے لئے پہلے مذہبی قومیت کے مقابلے میں لسانی قومیت کی تحریک چلائی گئی۔ پھر اس کا نام لسانی قومیت کے شاہکار کی حیثیت سے بنگلہ دیش رکھا گیا۔ لہٰذا بنگلہ دیش لسانی قومیت کی ایک تحریک اور مذہبی قومیت کے خلاف سازش ہے جس کو قبول کرنے کے بعد نظریہ پاکستان اور مذہبی قومیت کی ایسی ہی نفی ہو جاتی ہے

جس طرح بت کو سجدہ کرنے سے توحید کی نفی۔

بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کی حمایت کرنے والوں کی طرف سے اب تک جو دلائل پیش کئے گئے ہیں وہ عام طور پر نہایت سطحی ہیں اور ان کا طریقہ استدلال غلط فہمی پر مبنی ہے۔

ا۔ یہ دلیل عام طور پر پیش کی جاتی ہے کہ بنگلہ دیش اب ایک حقیقت بن گیا ہے جسے دنیا کے بیشتر ممالک نے تسلیم بھی کر لیا ہے اس لئے پاکستان کو چاہئے کہ وہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرے۔

اس دلیل میں کوئی وزن اور صداقت نہیں ہے کیونکہ دنیا میں بہت سی باطل حقیقتیں اپنی جگہ حقیقتیں ہیں مگر کسی طرح قابل قبول اور لائق تسلیم نہیں ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اسرائیل نامی ایک حکومت بیس بائیس سال سے جغرافیہ عالم پر قائم ہو چکی ہے اور دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں، اسے تسلیم کر کے اس کی سرپرستی بھی کر رہی ہیں اور مزید یہ کہ ترکی، ایران اور عراق جیسے اسلامی ملکوں نے بھی اسے تسلیم کر لیا ہے مگر ابھی تک پاکستان نے اس جیتی جاگتی حقیقت کو تسلیم نہیں کیا اور تسلیم نہ کرنے میں وہ حق بجانب بھی ہے۔ کیونکہ اسرائیل کو تسلیم کرنے سے دنیا کے عام مسلمانوں کے دینی و قومی جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے اور اسلامی اخوت کے اصول کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔

اور کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ بھارت نے بہت سے مسجدوں کو رہائشی مکانوں اور مویشیوں کے اصطبلوں میں تبدیل کر دیا ہے اور واگذار ہونے کی بھی کوئی توقع نہیں ہے۔ کیا کوئی غیرت مند مسلمان اس حقیقت کو تسلیم کر کے تبدیل شدہ صورت کو جائز قرار دے سکتا ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہماری ہزاروں مائیں، بہنیں اور بیٹیاں مشرقی پنجاب کے ہندو اور سکھوں کے قبضے میں ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ ان کے گھروں میں ناجائز بچوں کی مائیں بھی بن چکی ہیں! کیا کبھی کسی مسلمان نے اس طرح غور کرنا پسند کیا ہے کہ چونکہ یہ ایک حقیقت بن چکی ہے لہٰذا اس حقیقت کو تسلیم کر کے انہیں ہندوؤں اور سکھوں کی جائز بیویاں قرار دیا جائے۔ علی ہذا بنگلہ دیش بھی ایک حقیقت ہے جو نظریہ پاکستان کے خلاف لسانی قومیت کی بنیادوں پر بھارتی جارحیت کے ذریعہ وجود میں آئی۔ مگر یہ حقیقت ہمارے اصول اور مذہبی قومیت والے نظریہ

پاکستان کے خلاف ہے اس لئے اس کو تسلیم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

رہی یہ بات کہ دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں نے اور بیشتر ممالک نے اسے تسلیم کرلیا ہے یہ بھی نہایت مہمل اور غلط استدلال ہے کیونکہ مذہبی قومیت کی بنیاد پر ایک الگ اسلامی ملک یعنی پاکستان کا محض مطالبہ ہی دنیا کی تمام لادینی طاقتوں کی نگاہ میں عموماً اور بڑی طاقتوں کی نظر میں خصوصاً ابتداہی سے کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ انہیں خطرہ تھا کہ مذہبی قومیت کی بنیاد پر اسلامی ملک کے وجود سے وحدت اسلامی، خلافت اسلامیہ اور اسلامی بلاک کا عام رجحان پیدا ہو جائے گا پھر دنیا کے وہ بیشتر ممالک جنہوں نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرلیا ہے اس اقدام سے ان کا کوئی ٹھوس اور ملکی اصول نہیں ٹوٹتا بلکہ ان کی اسلام دشمنی اور مسلم بیزاری کی روایت کے عین مطابق ہے لیکن وہ پاکستان جس کا وجود ہی مذہبی قومیت کے تصور اور عقیدے سے پایا ہو وہ کس طرح لسانی قومیت کے تراشے ہوئے بت کے سامنے سر تسلیم خم کردے۔

۲۔ بنگلہ دیش کی حمایت کے سلسلے میں بعض افراد نے دوسروں کو بے وقوف بنانے کے لئے لاہور میں پاس ہونے والی ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان کی آڑ لینے کی کوشش کی ہے اس قرارداد میں مشرقی و مغربی دو پاکستان کا تصور پیش کیا گیا ہے گویا کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا قرارداد پاکستان کے تقاضے کو پورا کرنا ہے اور اس اصول پر عمل کرنا ہے۔ حالانکہ قرارداد پاکستان سے مشرقی و مغربی دو الگ پاکستان کا وجود ثابت کرنا قرارداد میں تحریف اور خیانت کے مترادف ہے جبکہ خود قائداعظم مشرق و مغرب کو ایک کر کے کل پاکستان کے پہلے سربراہ بھی رہ چکے ہیں اور اگر بالفرض قرارداد کی آڑ میں یا قرارداد سے ہٹ کر دو الگ اور خودمختار پاکستانوں کا قیام عمل میں بھی لایا جائے تب بھی اس سے ہمارا مذہبی قومیت والا نظریہ پاکستان مجروح نہیں ہوتا بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ نظریہ پاکستان کی بنیاد پر قائم ہونے والے دو ایسے ملک ہیں جن دونوں کی بنیاد ایک یعنی مذہبی قومیت ہے مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ بنگلہ دیش مشرقی پاکستان کی طرح کا ملک ہے۔ اور بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ مشرقی پاکستان کو تسلیم کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ مشرقی پاکستان کی بنیاد وہی نظریہ پاکستان

تھی اور بنگلہ دیش کی بنیاد لسانی قومیت ہے اگر آج بھی شیخ مجیب الرحمٰن بھارت کی دی ہوئی لسانی قومیت کو چھوڑ کر اپنے علاقے کا نام مسلم بنگال یا مشرقی پاکستان رکھیں تو اس کو الگ ملک تسلیم کرنے سے ہمارے نظریہ پاکستان پر کسی قسم کی آنچ نہیں آتی اور بنگلہ دیش کے نام سے اس کو الگ ملک تسلیم کرنے سے ہمارے فلسفہ قومیت کی نفی ہو جاتی ہے۔

۳۔ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے حق میں یعنی سادہ لوح رہنماؤں نے اس طرح کا استدلال بھی پیش کیا ہے کہ مشرقی پاکستان سات کروڑ کی آبادی کا ملک ہے۔ وہ اگر پاکستان کے ساتھ رہنا نہیں چاہتا تو زبردستی ساتھ رکھنا اور انہیں آزادی نہ دینا عالمی سیاست اور انسانی منشور کے خلاف ہے لہٰذا بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا ایک علاقے یا صوبے کے باشندوں کے جذبات آزادی کا احترام کرنا ہے۔۔

اس قسم کا استدلال وہی لوگ کر سکتے ہیں جو یا تو آزادی ہند اور قیام پاکستان کی تحریک سے بالکل نا آشنا ہیں اور جذبات سے کھیلنے والے الفاظ کے پردے میں دیدہ و دانستہ اصل حقائق کو چھپانا چاہتے ہیں۔

دراصل ہند اور قیام پاکستان دو الگ الگ حقیقت ہیں اور دونوں کے لئے الگ الگ تحریکیں چلائی گئیں۔ انگریز کی غلامی سے گلوخلاصی کا نام آزادی ہند ہے اور تیس کروڑ ہندوؤں کی غلامی سے دس کروڑ مسلمانوں کی نجات کا نام قیام پاکستان ہے۔ فرنگی اقتدار کے خلاف آزادی ہند کی تحریک مشترکہ تھی جس میں قربانیاں دینے میں مسلم قوم ہندو سے زیادہ پیش پیش تھی مگر جب برصغیر کی آزادی کا چارج لینے کا وقت آیا تو مسلم قوم کو آزادی سے محروم رکھنے کے لئے ہندو قوم نے آزاد ملک کا چارج بلاشرکت غیرے تنہا اپنے ہاتھ میں لینے کی سازش کی۔ پھر ہندو کی غلامی سے آزادی کے لئے دو قومی نظریہ کی بنیاد پر ایک اور تحریک چلی اور وہ تنہا مسلم قوم کی تحریک تھی جس میں برصغیر کے مسلمان اکثریت والے علاقوں نے بھی حصہ لیا اور مسلم اقلیت والے علاقوں نے بھی بلکہ مشرقی پنجاب کے سوا تمام مسلم اکثریت والے علاقوں نے عام طور پر صرف بھرپور حمایت کی اور مسلم اقلیت والے علاقوں کی زمین شہداء پاکستان کے خون سے سرخ

ہوگئی تحریک پاکستان کی یہ خصوصت کسی مرحلے پر بھی نظر انداز نہیں کرنی چاہیئے کہ مسلم اکثریت والے علاقوں کو ایک متحدہ اسلامی وطن بنانے کی جدوجہد اور خونیں جنگ ان اقلیت والے علاقوں میں بھی لڑی گئی ہے جو پاکستان کے نقشے میں شامل نہیں تھے۔

چنانچہ ہندوستان کی آزادی ہندو مسلم مشترکہ جدوجہد سے حاصل ہوئی اور برصغیر کے مسلمانوں کو پاکستان کی صورت میں جو آزادی ملی وہ تنہا برصغیر کی پوری مسلم قوم کی جدوجہد سے حاصل ہوئی۔

گویا مشرقی و مغربی پاکستان کے قیام میں پوری دس کروڑ مسلم قوم کا مجموعی خون شامل ہے اور وہ پوری مسلم قوم کی مشترکہ امانت ہے اب کسی صوبے اور کسی ضلع کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ دس کروڑ مسلمان کی قربانیوں سے حاصل شدہ ملک کے کسی حصے کو خودمختار اور الگ ریاست بنالے کیونکہ مشرقی و مغربی پاکستان کی جنگ یوپی، سی پی، مدراس اور بہار میں بھی لڑی گئی تھی۔ مشرقی و مغربی حصوں کو پاکستان بننے کا شرف ان لاکھوں شہداء کے خون کی بدولت حاصل ہوا ہے جو مشرق و مغرب سے زیادہ اقلیت والے علاقوں میں بہایا گیا تھا۔ اب کسی حصہ کو آزاد ریاست کی حیثیت دینا کسی کالونی کو آزاد کرنے کی طرح نہیں ہے۔ بلکہ پاکستان کو توڑ دینے کے مترادف ہے۔

غرضیکہ بنگلہ دیش پاکستان کو نظریاتی طور پر ختم کرنے کی بھارتی سازش اور لسانی قومیت کی تحریک کا نام ہے اس کو ملک سمجھ کر تسلیم کرنے کا ارادہ کرنا پاکستان کے وجود کو ختم کرنے کے مترادف ہے اور یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کی بڑی تعداد اب تک بنگلہ دیش کی حامی نہیں ہے اور وہ اب تک مذہبی قومیت اور نظریہ پاکستان کے پرستار ہیں۔ اگر بنگلہ دیش کو تسلیم کر کے ملک کی مذہبی قومیت کا سودا کرلیا گیا تو مغربی پاکستان کے وجود اور تقسیم ہند کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا اور پھر کشمیر کا فیصلہ قدرتی طور پر بھارت کے حق میں ہوجاتا ہے لہٰذا کوئی سیاسی پارٹی یا ملک کا کوئی سربراہ حتیٰ کہ قومی اسمبلی بھی اس کی مجاز نہیں ہے کہ وہ بنگلہ دیش کو تسلیم کر کے ملک کے وجود کی بنیادوں کو مسمار کردے۔

اس سے ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ بھارت کے ساتھ تعلقات استوار نہ کئے جائیں یا ان سے تجارتی و سفارتی مراسم نہ رکھے جائیں! بلکہ ہمارا ابتداہی سے یہ خیال رہا ہے کہ دونوں ملکوں کے مابین مستقل اور پائیدار امن کے بغیر دونوں ملک ترقی نہیں کر سکتے۔ مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ دونوں ملک ایک دوسرے کی ملکی سرحدوں اور نظریاتی بنیادوں کو دل سے قبول کر لیں اور تقسیم ملک سے پیدا ہونے والی تلخیوں کو سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے نہ بڑھائیں۔

تقسیم ہند کی تاریخ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے آج تک بھارت کے سیاسی نیتاؤں نے مذہبی قومیت والے نظریہ پاکستان کو تسلیم نہیں کیا جس کی بناء پر ہندوستان تقسیم ہوا اور پاکستان وجود میں آیا۔ گویا بھارت کی نظر میں مذہبی جذبات کے ہنگامی اور عارضی ابھار سے پاکستان بن گیا ہے۔ وطنی ولسانی امتیاز کو ہوا دینے سے یہ گھروندا بیٹھ جائے گا چنانچہ بھارت نے بڑے پیمانے پر پاکستان میں لسانی قومیت کا پروپیگنڈہ کرایا اور پھر مسلح جارحیت سے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش کا بنا دیا اب بھی پاکستان کی طرح اگر بھارت کی بھی واقعی خواہش ہے کہ دونوں ملک پائیدار امن کے ساتھ ساتھ ملکر ترقی کریں تو اس کو بنگلہ دیش کے مسئلے سے دستبردار ہو کر کھلے دل سے دوستی کی تجدید کریں اور ایک دوسرے کے نظریاتی حدود کا احترام کریں۔ اگر بھارت غیر ملکی طاقتوں کے گھمنڈ میں پاکستان سے باوقار دوستی ضروری نہیں سمجھتا تب بھی اپنے بنیادی اصول اور نظریات کا سودا کسی قیمت پر نہیں کیا جا سکتا۔ ہم اپنے بنیادی نظریات پر ڈٹے رہیں، راہ کی سختیوں کو جھیلیں اور امید رکھیں کہ ایک دن بنگلہ دیش ہند کی غلامی سے نکل کر پھر پاکستان کے ساتھ شامل ہو جائے۔

ڈالی گئی جو فصل خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحاب بہار سے
ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

خطیب اسلام، عالم ربانی
حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ کی یاد

حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی رحمۃ اللہ علیہ پاکستان کے اولیں کاروان علم وعزیمت کے سرخیل تھے۔ وہ دارالعلوم دیوبند کے سپوت اور شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے معتمد خاص اور دست راست تھے۔ تحریک پاکستان میں اور قیام پاکستان کے بعد پاکستان کے اسلامی تشخص کے قیام وتحفظ اور دینی اقدار کی بالادستی کے لئے اہل حق کی جدوجہد کے موضوع پر کوئی مورخ جب بھی قلم اٹھائے گا یا محض دین کی آبرو کے لئے حاکمان وقت سے عالمانہ وقار اور استقامت کے ساتھ اختلاف کرنے والے علماء حق کا جہاں کہیں بھی کوئی تذکرہ کرنا چاہے گا مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم کا اسم گرامی تاریخ کے افق پر اسے آفتاب و ماہتاب کی مانند چمکتا ہوا نظر آئے گا۔ قیام پاکستان کے بعد شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی جدوجہد جو دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد کی منظوری پر منتج ہوئی، اسلامی نظام کی متفقہ اساس فراہم کرنے کے لئے ملک کے اکتیس جید دینی زعماء کو جمع کرکے بائیس اسلامی نکات مرتب کروانا رویت ہلال کی شرعی اہمیت کو تسلیم کرانے کے لئے وقت کے آمروں اور ڈکٹیٹروں کے سامنے خم ٹھونک کر آ جانا اور اس جدوجہد کے نتیجے میں سرکاری سطح پر رویت ہلال کمیٹی کا قیام پھر مولانا مرحوم کا اس کا پہلا سربراہ مقرر کیا جانا خداداد حسن صوت اور لحن داؤدی تلاوت قرآن کے ساتھ والہانہ پیار اور تقریر کا درد وشوق فرواں حضرت مولانا مرحوم کی وہ خصوصیات ہیں جن سے کوئی بھی صرف نظر نہیں کرسکتا۔

امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا ذکر و بیان انہیں جان سے عزیز تھا چنانچہ انہوں نے جان بھی بیان سیرت النبیؐ کے سفر تبلیغ میں جان آفرین کے سپرد کی

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دارو رسن کہاں

آج سے ٹھیک انیس سال پہلے بھارت کے صوبہ مدراس میں وہ مسلسل جلسہ ہائے سیرت سے خطاب کررہے تھے کہ پیغام اجل آ گیا اور ۱۱/اپریل ۱۹۸۰ھ کو ان کی روح جسم کا ساتھ چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے فرستادہ فرشتوں کے ساتھ چلی گئی۔ ان کی یاد میں ۱۱/اپریل بروز اتوار خطیب اسلام حضرت مولانا تنویر الحق تھانوی کی زیر سرپرستی تحریک انصار الاسلام ایک عظیم الشان خطیب اسلام کانفرنس کا اہتمام کررہی ہے اس موقع پر نور علیٰ نور مولانا مرحوم کی یاد میں لکھی گئی جناب قاری محمد مسلم غازی صاحب کی نظم اور قطعات شائع کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہے۔

عبدالرشید انصاری

بیاد مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم و مغفور

حلقہ دین و شریعت ہے اداس
آج ہر ایک فرد ملت ہے اداس

واعظ شیریں بیاں رخصت ہوا
کیا کہوں کیوں ہر طبیعت ہے اداس

منبر و محراب مسجد سوگوار!
محفل وعظ و نصیحت ہے اداس

اے خطیب وقت رحلت پر تری
آج خود فن خطابت ہے اداس

محفلیں نوحہ کناں ہیں تجھ پہ آہ
بزم آرا، تجھ پہ جلوت ہے اداس

کوچہ اہل وفا تاریک ہے!
زمرہ اہل محبت ہے اداس

ہر طرف ہے شور ماتم آہ آہ
آنکھ گریاں اور بصارت ہے اداس

کون ذکر سرورؐ عالم کرے
اجتماع ذکر سیرت ہے اداس

روشنی دے کر ستارہ چھپ گیا
غازی خستہ کی قسمت ہے اداس

حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمہ اللہ کی نادر روزگار اور معرکہ آراء کتاب
مثنوی مولوی معنوی کی جامع اور لاجواب اردو شرح

علماء صوفیاء کیلئے عظیم خوشخبری

کلید مثنوی

حضرۃ حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانویؒ کے قلم سے

مثنوی... وہ مقبول خاص وعام کتاب ہے کہ خواندہ ناخواندہ سب ہی اس سے دلچسپی لیتے ہیں۔ مگر مضامین عالیہ ہونے کی وجہ سے مطالب سمجھنے میں بڑی دقت پیش آتی ہے اور بعض اوقات نوبت گمراہی تک پہنچ جاتی ہے۔ حضرت حکیم الامت نے اشعار مثنوی کو واضح کر کے مسائل تصوف کو عام فہم بنا کر نہایت خوبی سے سمجھا دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس سے معتبر اور شریعت وطریقت کا پاس ادب رکھ کر مضامین کو حل کرنے والی اور کوئی شرح نہیں لکھی گئی۔

اکابر کے ارشادات مثنوی کے بارہ میں

یہ مثنوی حضرت تبریزی رحمہ اللہ کے سینے کی آگ ہے جو حضرت رومی رحمہ اللہ کی زبان سے مثل آتش فشاں برآمد ہوئی

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: تین کتابیں انوکھی:
قرآن شریف.... بخاری شریف... مثنوی شریف

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا ارشاد ہے:
بعض مذاق کے لئے... مثنوی... بمنزل ذکر اللہ ہے۔

حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمہ اللہ کا ارشاد ہے:
مثنوی سینے میں عشق خداوندی کی آگ لگا دیتی ہے۔

پاک وہند میں پہلی بار اعلیٰ کمپیوٹر ایڈیشن مکمل 24 حصے دس جلدوں میں قیمت -/4500